راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 24واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ

ارژنگ لاہور

جولائی ۲۰۲۳ء

مدیرِ اعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی، لبنیٰ صفدر

ذہنی طور پر ہمیشہ ترقی پسند تحریک کے قریب رہا ہوں

میرا دل شاعری کے زیادہ نزدیک ہے

نامور شاعر، ادیب، محقق، تنقید نگار اور ماہر تعلیم

ڈاکٹر نجیب جمال

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،
کالم نگار اور سفرنامہ نگار **عامر بن علی** کا مکالمہ

تخلیق کار کے لئے تخلیقی کرب سے گزرنے کے بعد آسودگی کا لمحہ آتا ہے

ڈاکٹر نجیب جمال شعروسخن کا ایک ممتاز اور روشن حوالہ ہیں۔ تحقیق کے حوالے سے ان کے کام کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔ عمر کا زیادہ تر حصہ ادب پڑھتے اور پڑھاتے گزرا۔ خوبصورت شعر کہتے ہیں اور باکمال نثر نگار ہیں۔ ان جیسا وسیع اور گہرا مطالعہ ہمارے عہد میں کم کم سخن وروں اور اساتذہ کا اعزاز ہے۔ ان کا خصوصی شکریہ کہ ہماری فرمائش اور درخواست پر انہوں نے انٹرویو کے لئے وقت نکالا۔ اس حقیقت کے سبب سے اور بھی زیادہ مشکور ہیں کہ وہ اس وقت امریکہ میں ہیں۔ سفر میں ہونے کے باوجود انہوں نے ہم سے کیا ہوا وعدہ نبھایا اور قارئین ارژنگ کے ذوق مطالعہ کے لئے مکالمے کا اعزاز بخشا۔ سرتاپا محبت میں رچے بسے ایک ایسے تخلیق کار اور تنقید نگار جن کا دم قوم ووطن کے لئے غنیمت ہے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

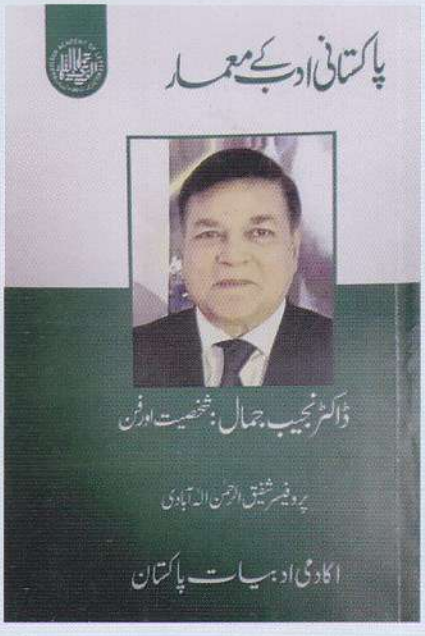

رلوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 24 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد 24 جولائی 2023

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیران ◉ حسن عباسی ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس ادارت}

✽ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ✽ سعدیہ سیٹھی

{مجلس مشاورت}

✽ ظفر خان (امریکا) ✽ ارشد نذیر ساحل (کینیڈا)

کمپوزنگ ۔ زرتاب کمپوزنگ: 0321-4730769 ڈیزائنر ۔ نعمان حسن: 0333-4918383

سرورق: عمران شناور

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الحمید سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 بازاری کاروباری: 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ، یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ مکمل کاپی بذریعہ ڈاک بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت 2

مضامین: ○ ٹی ایس ایلیٹ کی نظم "دی ویسٹ لینڈ" / ڈاکٹر اے بی اشرف ، 4

○ شاعری کا آغاز (Origin) ، جارج تھامسن / مترجم: مصطفیٰ کریم ، 9

○ اُردو ناول کے رنگ / پروفیسر جمیل آذر ، 13

○ یادوں کے دیپ لیے / پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا ، 15

○ در نبیؐ سے مگر رابطہ ضروری ہے / عبدالوحید بسمل ، 17

○ شب نشین......ایک مطالعہ / محمد نوید مرزا ، 20

○ ندرِ خیال......ایک مطالعہ / ڈاکٹر عادل سعید قریشی ، 21

○ حمد خالص کا شاعر / شاعر علی شاعر ، 24

شعری گوشے: طاہر عدیل، اکمل حنیف ، 26 تا 27

انٹرویو: احمد فراز سے محمد آصف بھلی کی خصوصی گفتگو / محمد آصف بھلی ، 28

○ بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر نجیب جمال / عامر بن علی ، 31

○ بقیہ انٹرویو: جمیل یوسف / عامر بن علی ، 34

شاعری 37 تا 40

○ قرۃ العین کی تحریریں / قرۃ العین ، 41

طنز و مزاح ○ مہا شاعر ظفر اقبال صاحب کی حمایت میں / ابرار ندیم ، 43

○ شبابِ ثاقب / فخر زمان فخر ، 44

سفرنامہ ○ شہرِ سخن / عامر بن علی ، 45

افسانے ○ ڈنک / بشریٰ رحمٰن ، 46

○ ناموس کی قیمت / فیروز عالم ، 48

○ عاصم بخاری کی شاعری میں مقامیت / مقبول ذکی مقبول ، 52

شعری گوشہ ○ عدیل احمد آسی ، 54

○ مختصر ادبی خبریں ، 55

○ نامہ ہائے احباب ، 56

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ

حمد گوئی شعار کرتا ہوں
حرف کو باوقار کرتا ہوں
کتنا ناداں ہوں رحمتوں کو تری
اُنگلیوں پر شمار کرتا ہوں
تو جو کرتا ہے بار بار معاف
میں خطا بار بار کرتا ہوں
اس قدر عفو پر ہے تیرے یقیں
حشر کا انتظار کرتا ہوں
حمد ہے بحر بے کنار اے حرف
میں تجھے بے کنار کرتا ہوں
رنگ وحدت ہے جو میں کثرت سے
حمد میں آشکار کرتا ہوں
میں اداؤں سے حمد کی یارب
منکروں کو شکار کرتا ہوں
غازۂ حمد و نعت سے قیصرؔ
زندگی کا سنگھار کرتا ہوں

قیصر نجفی/کراچی

طیبہ کے گلی کوچہ و بازار کو ترسیں
ہم گنبدِ خضریٰ کے بھی انوار کو ترسیں
اِک وہ کہ کھلی آنکھ سے دیکھا رُخِ انور
اِک ہم کہ سدا خواب میں دیدار کو ترسیں
اِک وہ کہ سُنیں آپ سے قرآن کی آیات
ہم حشر تلک آپؐ کی گفتار کو ترسیں
ہاں آپؐ نے اصحابؓ کو دی جرأتِ اظہار
اس دور میں بندے لبِ اظہار کو ترسیں
اِنساں کو عطا آپؐ نے فرمائی جو رِفعت
اِس دور کے انساں اُسی معیار کو ترسیں
اِک وہ کہ رہی چشمِ کرم آپؐ کی جن پر
اِک ہم کہ اُسی رحمتِ سرکارؐ کو ترسیں
آ جائے نظر آپؐ کی سیرت کا سراپا
ہر دور میں اِنساں اُسی کردار کو ترسیں
جس عہد کو روشن کیا خود نورِ ہُدیٰ نے
ہم اَب بھی اُسی عہد کے آثار کو ترسیں

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

ہے رحمتِ الٰہ مدینے کی راہ میں
ذرے ہیں مہر و ماہ مدینے کی راہ میں
اللہ رے شانِ صاحبِ خیرِ کثیرِ کُل
کاسہ بکف ہیں شاہ مدینے کی راہ میں
جو لوگ تھے جہان میں مدت سے دربدر
ان کو ملی پناہ مدینے کی راہ میں
گردِ سفر کے فیض سے ہو جائے سُرخ رُو
آئے جو رُو سیاہ مدینے کی راہ میں
پاؤ گے ذرے ذرے کو مشعل بکف یہاں
دیکھو تو اک نگاہ مدینے کی راہ میں
اتنے تو آسمان کے دامن میں بھی نہیں
جتنے ہیں مہر و ماہ مدینے کی راہ میں
ہر روز خود کو خواب میں دیکھا ہے مظہری
گاہے نجف میں گاہ مدینے کی راہ میں

غلام حسین مظہری/لاہور

رُوزِ اول ہی سے مرہونِ کرم تیرے ہیں
ہم کہ پالے ہوئے قسّامِ نعم تیرے ہیں
بامِ امکان پہ ضوریز ثنا ہے تیری
لوحِ ادراک پہ اوصاف رقم تیرے ہیں
ہیں ضیا پاش اُنہی سے یہ مہ و مہر و نجوم
ثبتِ افلاک پہ جو نقشِ قدم تیرے ہیں
جاہ و حشمت سے علاقہ ہے نہ دنیا سے غرض
ہم طلبگار شہنشاہِ اُمم تیرے ہیں
مجھ کو رکھتے ہیں غمِ گردشِ دوراں سے پرے
غم جو مستور پسِ دیدۂ نم تیرے ہیں
گو کہ اعمال سے خالی ہیں ہمارے دامن
لیکن اس بات پہ نازاں ہیں کہ ہم تیرے ہیں
تیری نسبت نے کسے رکھا ہے محرومِ کرم
کیوں نہ ہم ہوں گے سزاوارِ ارم، ''تیرے ہیں''
مجھ کو خوش آتی نہیں غیر کی توصیف و ثنا
تذکرے لب پہ مرے دم بہ دم تیرے ہیں
آنکھیں راہوں میں بچھائے ہوئے اے شاہِ عرب
منتظر کب سے سبھی اہلِ عجم تیرے ہیں
شادکامی نے کیا اُن کے مقدر کا طواف
جن کے سینوں میں تڑپ تیری ہے، غم تیرے ہیں
ایک ہم ہی تو نہیں چاہنے والے تیرے
دل اغیار میں بھی نصب علم تیرے ہیں
تیری رحمت اُنہیں آغوش میں لے لیتی ہے
دل سے اک بار جو کہتے ہیں کہ ہم تیرے ہیں
تھک کے گرتے نہیں وہ لوگ کسی منزل پر
حوصلے جن کو زمانے میں بہم تیرے ہیں

کیوں نہ روشن ہوں مدینے کی زمیں کے ذرے
ضوفشاں جلوے سرِ بامِ حرم تیرے ہیں
مصحفِ حق میں اٹھاتا ہے خدا جن کی قسم
اے مرے شاہ وہ انداز و شیم تیرے ہیں
مظہری تجھ سے نہ مانگے تو وہ مانگے کس سے
کُل کا مختار ہے تُو ہست و عدم تیرے ہیں

غلام حسین مظہری/ لاہور

لب پہ صلِّ علیٰ کا اثر، یا رسولؐ
مر بھی جاؤں ہو جاؤں اَمر یا رسولؐ
اللہ کے بعد ذی شان والا مقام
آپؐ ہیں رقصۂ مختصر، یارسولؐ
یاد تیری ہو دل میں مرے یا نبیؐ!
سر مرا ہو تو تیرا ہو در، یارسولؐ
ہو کرم کی نظر، حشر و میزان کے
ہوویں آسان میرے سفر، یارسولؐ
اُس کو جنّت کے جلووں کی خواہش ہو کیا
جس کا مسکن ہے تیرا نگر یارسولؐ
بھیگی پلکوں سے تکتا رہوں روز و شب
سبز گنبد ہو پیشِ نظر، یارسولؐ
حجرِ اسود کو بوسہ دیا آپؐ نے
کس قدر وہ ہوا معتبر یارسولؐ!
صد مبارک، زمیں سے تا عرشِ بریں
عظمتوں والا تیرا سفر، یارسولؐ!
خوب صورت جہاں میں ہزاروں ہیں، پر
خوب صورت تریں تیرا گھر، یارسولؐ
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ تیری شان
آپؐ ہیں محترم معتبر یارسولؐ!

وقتِ آخر ہے دیدار طے آپؐ کا
نیند آتی نہیں رات بھر یارسولؐ!
ساری دنیا سے بڑھ کے ہے زائرؔ، ترا
اُمتی ہے گنہ گار تر، یارسولؐ!

عبدالقیوم زائرؔ/ امریکا

اس مریض حظی کی دوا نعت ہے
درد غم جو بھی ہے بس شفا نعت ہے
خالی کاصہ نہ ہو صدقہ حسنین کا
مانگتا ہر گھڑی یہ گدا نعت ہے
سرمدیں نغمیں گونجیں ہیں صلی علیٰ
لب کشا آج بادِ صبا نعت ہے
رحمتوں کے ہیں موسم یوں کہنے لگے
یہ ہوا نعت ہے یہ فضا نعت ہے
میں نے عشق نبیؐ کی جو کھولی لغت
حرف الفاظ مصرعہ بنا نعت ہے
ان کی توصیف روشن ہوئی ہر طرف
روشنی نور جلوہ ضیا نعت ہے
آپ اول بھی ہیں آپ آخر بھی ہیں
ابتدا نعت ہے انتہا نعت ہے
مجھ کو جب بھی جہاں بھی مصیبت پڑے
مجھ کو ہر لمحہ لیتی بچا نعت ہے
نعت کے جو چمن میں رہے رات دن
ہوتی اس کو یقیناً عطا نعت ہے
نعت کے ہی سبب مجھ کو خوشیاں ملیں
مجھ کو غم سے بچاتی سدا نعت ہے
ہر طرف ہیں رفعنا کے جلوے عیاں
اس لیے آپ کی ہر جگہ نعت ہے

یہ بھی صلی علیٰ کی ہے حکمت سمجھ
کملی والے سے ملتی جزا نعت ہے
آپ کی بات حکمت سے خالی نہیں
اس لیے آپ کی ہر ادا نعت ہے

عتیق الرحمٰن حکمتؔ/ حاصل پور

آپ کے لطف سے حالات بدل جائیں گے
واہ کیا بات ہے ہم لوگ سنبھل جائیں گے
نعرہ تکبیر و رسالت کا لگے گا جب بھی
کفر کے دل بھی جہاں بھر میں دہل جائیں گے
روز جیتے ہیں یہی آس کا پی کر پیالہ
نہ سہی آج اگر طیبہ میں کل جائیں گے
گنبدِ خضریٰ جب آنکھوں میں سما جائے گا
میرے جذبات اسی لمحے مچل جائیں گے
آپ کی یاد کو لفظوں میں سجانا ہے مجھے
خود خیالات مرے نعت میں ڈھل جائیں گے
جس گھڑی آپ کی ہو جائے گی چشمِ اُلفت
گردشِ دوراں سے ہم لوگ نکل جائیں گے
پھول چنتے ہیں سدا صلِ علیٰ کے حالی
لمحے جتنے بھی ہوں مشکل وہ تو ٹل جائیں گے

محمد ذوالقرنین جواد حالی/ حاصل پور

ٹی ایس ایلیٹ کی نظم ''دی ویسٹ لینڈ''

ڈاکٹر اے بی اشرف

''ویرانہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کی مشہورِ زمانہ نظم "The Waste Land" کا ترجمہ اردو میں کیا ہے جسے ادارۂ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب لاہور نے ایک کتابچے کی صورت میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔

ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ، جیسا کہ سب جانتے ہیں، انگریزی ادبیات کے نامور شاعر، نقاد اور ڈرامانویس تصور ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے انگریزی ادیبوں میں ان کو ایک نمایاں اور منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ امریکہ کے ایک شہر سینٹ لوئیس (میسوری) میں 1888ء کو پیدا ہوئے۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایک سال ہارورڈ ہی میں فلسفے کے شعبے میں بطور اسسٹنٹ کام کیا۔ پھر ادب اور فلسفہ کی تعلیم کے لیے پیرس چلے گئے۔ 1911ء میں واپس امریکہ آئے اور ہارورڈ میں ہندوستانی فلسفہ اور سنسکرت پڑھی اور ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنی بقیہ زندگی یورپ اور برطانیہ میں گزاری۔

ملازمت کا آغاز لندن کے ایک سکول میں ٹیچر کی حیثیت سے کیا۔ بعد میں کچھ عرصہ بنک میں بھی ملازم رہے۔ 1922ء میں ایک ادبی جریدہ "Criterion" کے نام سے جاری کیا جو 1939ء تک شائع ہوتا رہا۔ ایک پبلشنگ ہاؤس فیبر اینڈ فیبر کے نام سے قائم کیا۔ اسی دوران میں ان کی دوستی ایک امریکن شاعر ایذرا پاؤنڈ سے ہوئی جو ساری زندگی قائم رہی اور حقیقت یہ ہے کہ ایذرا پاؤنڈ کے اثرات ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری پر بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایلیٹ نے ''دی ویسٹ لینڈ'' کا مسودہ اس کو پیرس میں دیا تھا اور پاؤنڈ نے اس نظم کی کانٹ چھانٹ کے بعد اس کو آدھا کر دیا اور اس کی ہیئت بھی مقرر کی۔

ٹی ایس ایلیٹ، ورڈز ورتھ اور کولرج کی طرح ایک نئی شاعری کا نمائندہ ہے لیکن ورڈز ورتھ اور کولرج کی طرح وہ رومانویت کا قائل نہیں بلکہ ''مابعد اطبیعاتی ادراک'' کو حقیقی شاعری تصور کرتا ہے۔ وہ روایت کا پابند ہے اور برملا اپنے کلاسیکی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ کالرج کے برخلاف فن پارے کو تخیل کی نہیں بلکہ ادراک اور سلیقے کی پیداوار سمجھتا ہے گویا ان کی باتیں سوچی سمجھی جیسے غالب کا دیوان۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ''دی ویسٹ لینڈ'' میں مابعد الطبیعات کے عناصر کے ساتھ ساتھ رومانویت کا رنگ موجود ہے۔

یوں تو ٹی ایس ایلیٹ نے بے شمار نظمیں تخلیق کیں۔ ان کی شاعری کا کثیر ذخیرہ موجود ہے اور پوری دنیا میں اہلِ ادب و ذوق اس کا مطالعہ کر کے حظ اٹھاتے ہیں مگر ایلیٹ کا شاہکار (Magnum Opus) ان کی مقبول ترین نظم ''دی ویسٹ لینڈ'' (The Waste Land) ہے جس کو شعر و ادب کی دنیا میں بے مثال اور لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ اس کی تشریح و توضیح میں ہزارہا صفحات لکھے گئے۔ مضامین اور کتابیں وجود میں آئیں۔ انگریزی ادب کی تدریس اور اعلیٰ درجوں کے درس میں اس کا خصوصی مطالعہ شامل رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ''دی ویسٹ لینڈ'' ایلیٹ کی وہ طویل نظم ہے جو بیسویں صدی کی بہترین نظم تصور ہوتی ہے۔ اس کو جدید دور کے کلاسیک میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نظم کا پس منظر پہلی جنگِ عظیم کی تباہی و بربادی، بدامنی، دہشت گردی، قدیم و جدید کی کشمکش کے نتیجے میں ابھرنے والا کنفیوژن اور انتشار، بے یقینی اور مایوسی، معاشرتی زندگی کا زوال، موت کا خوف اور رزقِ خاک ہونے کا ڈر ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم کا موضوع ماڈرن زندگی بطور ویسٹ لینڈ یا ویرانہ ہے۔ ایلیٹ نے اس نظم میں اساطیری، ادبی اور ثقافتی اشارے کنائے، تشبیہات و استعارے، علامتیں اور تمثالیں استعمال کر کے اسے ایک مبہم، ادق اور مغلق نظم کی صورت میں پیش کیا۔ ثقیل اور نامانوس الفاظ اور تراکیب سے پُر یہ نظم خاصی ناقابلِ فہم اور مشکل نظر آتی ہے۔ چنانچہ جس طرح غالب کو اپنے بعض ادق اشعار کی وضاحت اپنے خطوط میں کرنا پڑی تھی اسی طرح ایلیٹ کو بھی نظم کے بعض حصوں اور علامتوں کی وضاحت کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ ایلیٹ نے خود اپنے استعمال کردہ استعاروں، کنایوں اور حوالوں کی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ بعض نوٹس تو نظم کی تشریح میں ممد ثابت ہوئے اور بعض مزید الجھن کا باعث بنے۔

اس نظم کا ڈھانچہ (Structure) جیمز جائس کے یولیسس کی طرح اکھڑا اکھڑا اور بکھرا بکھرا یعنی Disjointed سا ہے۔ ایلیٹ نے اس نظم میں لاطینی، یونانی، فرانسیسی اور سنسکرت زبانوں کے جملے استعمال کیے ہیں۔ بائبل، اپنشد، بدھ سرمن، جیمز فریزر کی کتاب ''شاخِ زریں (Golden Bough) کے علاوہ ہومر، سوفوکلیز، ورجل، آگسٹائن، ملٹن، ڈانٹے،

شیکسپیئر، سپنسر، چوسر، بودلیئر اور کئی دیگر نابغہ ادبی شخصیتوں کے ماخذات سے بھی استفادہ کیا ہے۔

اس نظم کا اسلوب خود کلامی (Monologue) کا سا ہے۔ نظم مختلف آوازوں کا مرکب ہے جو کبھی کبھی مکالمے اور ڈائیلاگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بولنے والوں کی آوازیں بدلتی رہتی ہیں۔ وقت اور مقام بدلتے رہتے ہیں اور مختلف ادبیات اور ثقافتوں کے حوالے آتے رہتے ہیں۔ پانچ حصوں پر مشتمل اس ڈرامائی نظم کے پہلے بند میں توہمات اور مایوسی کا تاثر ملتا ہے۔ دوسرے بند میں مختلف کردار دکھائی دیتے ہیں اور بیان بدل جاتا ہے۔ تیسرا حصہ فلسفیانہ تفکر کے ساتھ موت کی تمثالوں اور نفیِ ذات کے تاثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ چوتھے بند میں غنائیت کا تاثر ابھر کر پانچویں بند میں اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے اور نظم کا اختتام امن اور شانتی کی خواہش پر ہوتا ہے جسے بعض لوگوں نے مذہب کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے موضوع کے لحاظ سے ایلیٹ نے جنگِ عظیم اول کے بعد کے عہد کی زندگی کے اندرونی کرب اور بے چینیوں کو اس نظم میں قلم بند کیا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کی فوری وجہ یہ تھی کہ آسٹریا کے ولی عہد شہزادہ فرڈی نینڈ (Ferdinend) اور اس کی بیوی کو سارا جووا، بوسنیا میں جون 1914ء کو ہلاک کر دیا گیا۔ آسٹریا نے سربیا کی حکومت کو اس ہلاکت میں ملوث قرار دیا اور سربیا پر حملہ کر دیا۔ جرمنی اپنے اتحادی آسٹریا کی مدد کو آ پہنچا۔ ترکی نے بھی ان کا ساتھ دیا جبکہ روس نے اپنے اتحادی سربیا کی مدد کی۔ چنانچہ دوسری قومیں بھی اس جنگ میں کود پڑیں، جرمنی، آسٹریا اور ترکی کو شکست ہوئی۔ آسٹرو ہنگرین سلطنت ٹوٹ گئی۔ یوگوسلاویہ اور چیکوسلاویکیہ کی شکل میں تین نئی خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان ریاستوں نے پولینڈ، فن لینڈ، ریاست ہائے بلقان، استونیا، لیتھونیا کے ساتھ مل کر مشرقی یورپ میں ایک بلاک قائم کر لیا جو گویا سوشلسٹ بلاک تھا۔

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے پہلے کہا گیا ہے کہ ایلیٹ نے اس نظم میں اساطیری حوالے، ادبی و ثقافتی کنائے، مبہم علامات اور تمثالیں (Images) استعمال کر کے اسے ایک خاصی مشکل اور پیچیدہ نظم بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کی معنویت کی تہہ تک پہنچ کر اس کا ترجمہ کرنا اور اس کی روح کو ترجمے میں سمیٹنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اردو میں بہت سی نامور شخصیتوں نے یہ کوشش کی اور اس کے تراجم کیے۔ ان شخصیتوں میں عزیز احمد، رفیق خاور، پروفیسر سراج الدین، انیس ناگی، مبارک احمد اور ڈاکٹر محمد خاں اشرف نمایاں اور قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن میں بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس سب میں سے جو ترجمہ (اور وہ بھی منظوم) ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے کیا ہے وہ بہترین اور بے مثال ہے۔ اُن سے پہلے جن ادیبوں نے تراجم کیے وہ سب نثر یعنی منثور تراجم ہیں جبکہ یہ پہلا اور اب تک واحد منظوم ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمے کی صورت میں نہ صرف اس کے متن اور مفہوم کی معنویت کو تخلیقی سطح پر محسوس کر کے اس کی روح کو سمیٹ لیا بلکہ اس کی ظاہری ہیئت کو بھی برقرار رکھا مثلاً آغاز ہی میں

April is the cruelest month, breeding
اپریل ہے ظالم ترین مہینہ، اگائے

Lilacs out of the dead land, mixing
کلیاں مُردہ زمین میں سے، ملائے

Memory and desire, stirring
یادوں کو ارمانوں سے، ہلائے

Dull roots with spring rain
مضمحل جڑوں کو بہار کی بارش سے (ویرانہ سطر 1-4)

Stirring, mixing, Breeding کو اگائے، ملائے، ہلائے کے نہایت موزوں اور برموقع الفاظ میں ترجمہ کر کے چاروں سطروں (مصرعوں) کو بڑی ہنرمندی سے جوڑ کر بند مکمل کیا ہے۔ جو فضا، جو ماحول، جو تاثر اور ردِم انگریزی میں پیدا ہوا ہے وہی اردو ترجمے میں بھی در آیا ہے۔

اگرچہ نظم کا آغاز اپریل کی بہار کی آمد سے ہوتا ہے لیکن بجائے خوشی کے خوف اور پریشانی کا تاثر ابھرتا ہے۔ یہ خود موت کا ہے یعنی مٹھی بھر خاک بننے کا خوف۔

I will show you fear in a handful of dust
میں تمھیں دکھاؤں گا خوف ایک مٹھی بھر خاک میں (ویرانہ۔ سطر 30)

اگرچہ The Waste Land (ویرانہ) کے باسی مکمل طور پر زندہ رہنا بھی نہیں چاہتے مگر موت سے خوف زدہ بھی ہیں۔ نظم کے اس حصے میں Phoenician Sailor (فینشی ملاح) ڈوب کر مرتا ہے۔ گویا پانی اس کے لیے موت ہے زندگی کا باعث نہیں جبکہ پانی زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے کیونکہ سائنسی لحاظ سے زندگی کی نمود پانی سے ہوئی لیکن ویسٹ لینڈ کے لوگ گویا اس نظریے کو کھو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پیرس میں ایلیٹ کا ایک دوست جین ورڈینل (Jean Verdenel) تھا جو جنگ

عظیم اول میں گیلی پولی کے مقام پر مارا گیا تھا اور غالباً اُس کی موت پانی میں ڈوب کر ہوئی تھی۔ شاید اُسی کا حوالہ ایلیٹ نے دیا ہو۔ پھر میڈم سوسوس ٹرس (Madame Sosostris) کا دار پہ لٹکے مرد کو یہ کہنا ''مرگِ آب سے ڈر (Fear death by Water) ڈاکٹر صاحب نے اس مصرعے (The hanged Man. Fear death by water) کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

دار پہ لٹکا مرد۔ تو مرگِ آب سے ڈر (ویرانہ سطر 55)

میرے خیال میں یہ اردو مصرعہ اصل سے زیادہ بہتر ہو گیا ہے۔ مرگِ آب یہاں زوالِ حیات کے زمرے میں آتا ہے۔

لندن برج سے ہجوم کی صورت میں گزرتے لوگوں میں سے موت نے کتنوں کو ختم کر دیا اور ہر آدمی موت کے آگے سرِ تسلیم خم کیے اپنے قدموں پر نظر جمائے گزر رہا تھا، سینٹ میری وول ناتھ کے مُردے کا صدا کے ساتھ نو بجانا، لاش کا بویا جانا۔ یہ سب حوالے تدفینِ مردگان والے بند میں ایک ایسی فضا کو پیدا کرتے ہیں جس میں افسردگی، مایوسی، بیزاری، خوف، وحشت، بے معنویت اور مرگ کا تاثر شدید ہے۔ ایلیٹ نے یہ ساری فضا شعوری سطح پر قائم کی ہے۔ ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے بھی اپنے ترجمے میں اسی فضا کو قائم رکھا ہے۔ انگریزی متن کے بعد اردو متن کو پڑھیں تو ایک جیسا تاثر ابھرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک ایک لفظ کو جانچ تول کر استعمال کیا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے ترجمے کے متبادل الفاظ تلاش کروں لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ مثال کے طور پر Forgetful Snow کا ترجمہ 'فراموشانہ برف' کیا۔ Tuber کا 'ٹیوبروں'، Broken Images کا 'شکستہ تصورات'، Unreal City کا 'بے اصل شہر' جبکہ دوسری جگہ اس کا ترجمہ ''شہرِ باطل'' کیا ہے۔ اگر بند کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو دونوں ترجمے اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بدلا نہیں جا سکتا۔

اسی طرح دوسرے بند میں

When Lil's husband got demobbed, I said...

I didn't mince my words, I said to her myself,

HURRY UP PLEASE! IT'S TIME !

Now Albert's coming back, make yourself a bit smart.

He'll want to know what you done with that money he gave you

To get yourself some teeth. He did, I was there.

اس کا منظوم ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے اس طرح کیا ہے:

لیلیٰ کا شوہر لام سے آنے لگا تو خود، / لیلیٰ کو میں نے صاف کھرے طور پر کہا، / جلدی کرو براہِ کرم! وقت ہو گیا!

البرٹ ہے آتا، خود کو ذرا سمارٹ تو کرو / پوچھے گا تم نے کیا کیا اس رقم کا جو خود دی اُس نے تھی تمھیں نئے دانتوں کے واسطے (ویرانہ، سطر 139۔144)

کیا ردمک اور رواں ترجمہ کیا ہے۔

پانچویں بند میں ہندوستان کے حوالے سے اس بند کا کتنا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔

Ganga was sunken, and the limp leaves / Waited for rain, while the black clouds

Gathered far distant, over Himavant. / The jungle crouched, humped in silence.

سوکھی گنگا، سوکھے پتے / بارشیں مانگیں، کالے بادل / دور جمع ہیں، ہماونت اوپر دبکا جنگ، چُپ بیٹھا ہے۔ (ویرانہ۔ سطر 395۔398)

اسی طرح دیگر زبانوں کے حوالوں کو بھی بڑی خوبصورتی سے ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً جرمن

Frisch weht der wind / Der Heimat Zu. / Mien Irisch kind, / Wo weilest du?

اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

صبح ہوئی اور ہوا چلی / مرے دیس کو جاتی ہے / آئرلینڈ کی میری سوہنی مجھ کو ڈھونڈنے آتی ہے؟ (ویرانہ۔ سطر 31۔34)

فرانسیسی زبان کے حوالوں کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ اردو میں ڈھالا ہے۔

Et O Ces voixd' enfants, chantant dans la coupole!

اوہ یہ بچے، گانے کی آوازیں گنبد میں! (ویرانہ۔ سطر 202)

Le Prince d' Aquitania a la tour abolie

وہ پرنس ایکیٹینین جس کا مینار گرا (ویرانہ۔سطر 429)

اس قسم کی مثالوں سے پورا ترجمہ مترجم کی مہارت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

درحقیقت نظم میں مختلف مناظر، مختلف واقعات کی تصویریں/تمثالیں پیش کی گئی ہیں۔ گویا پوری نظم میں متنوع داستانیں پوشیدہ ہیں جو نہایت گہری معنویت کے حامل الفاظ میں پیش ہوئی ہیں۔ ان کے پیچھے تلازمات کا ایک سلسلہ ہے جو ابھر کر قاری کے تخیل کو مہمیز دیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان تلازمات کی تفہیم کے لیے قاری کی معلومات اور تخیل کا توانا ہونا ضروری ہے کیونکہ ٹوٹی پھوٹی اور شکستہ امیجز اور علامات کے ذریعے نظم آگے بڑھتی ہے۔ جیسے آفتاب طلوع ہو کر اپنا سفر طے کرنے لگتا ہے اور روشنیاں بکھیرتا چلا جاتا ہے اور پھر تھک ہار کر شام کے دھندلکوں کے پسِ پردہ رات کے اندھیروں میں غروب ہو جاتا ہے۔ یہ نظم بھی آفتاب کی طرح طلوع ہوتی، روشنیاں بکھیرتی، چمکارے مارتی آخر دھندلکوں میں ڈوب جاتی ہے اور اداسیوں کے سائے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ یہ نظم خاتمے پر اداس فضا کو بکھیر جاتی ہے۔ گویا اس کی ابتدا بھی اداسی سے ہوئی اور انتہا بھی۔

دراصل نظم کا بیک گراؤنڈ بیسویں صدی کے آغاز میں سوسائٹی کا زوال اور اقدار کی بربادی ہے۔ ایمان (Faith) کی کمی، سچی محبت اور خلوص کا فقدان، موت کا خوف، اقدار کا زوال، محبت اور سیکس کی گراوٹ، بے لگام ہوائے نفس (Lust) کی غلامی۔ مختلف نوعیت کے اس زوال کی کئی مثالیں دکھائی دیتی ہیں۔ پہلی مثال Sylvan Scene پیش کرتا ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے مہارت کے ساتھ کیا ہے:

The change of Philomel, by the barbarous king
So rudely forced; yet there the nightingale
Filled all the desert with inviolable voice
And still she cried, and still the world pursues,
Jug Jug, to Dirty ears.

تبدیلی پھیلومل کی، جسے وحشی شاہ نے/ بدلا ستم سے؛ پھر بھی وہ بلبل وہاں پہ تھی/صحرا کو اپنے گیت سے مسحور کر رہی

فریاد وہ کرے، مگر دنیا رواں یونہی/ 'جگ جگ' غلیظ کانوں میں۔ (ویرانہ۔سطر 99۔103)

''تبدیلی فیلومل کی (Philomel) تلمیح میں تھریس (ترکی میں واقع ہے) کے شہنشاہ ٹیریس (Tereus) کا حوالہ پوشیدہ ہے جس نے اپنی بیوی پروکنی (Procne) کی بہن فلومیلا یعنی اپنی سالی کی زبردستی عصمت دری کی اور اس کی زبان کاٹ دی تاکہ وہ کسی کو بتا نہ سکے۔ دیوتاؤں نے فلومیلا کو بلبل میں اور پروکنی کو ابابیل کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اگرچہ یہ صدیوں پہلے کی سیکس کرپشن کی مثال ہے لیکن آج بھی ایسے واقعات پیش آرہے ہیں (اے۔حمید کا بہت خوبصورت افسانہ غالباً 'زرد گلاب' اسی موضوع پر ہے)۔

پھر دوسرا سین لیلیٰ کے شوہر البرٹ کے لام سے آنے کا ہے۔ لیلیٰ (Lil) اس کی غیر حاضری میں کیا کچھ کرتی رہی ہے۔ اور اس کے اثرات اُس کے جواں جسم پر بھی پڑے ہیں۔ وہ کہتی ہے:

I can't help it, she said, pulling a long face,
It's them pills I took, to bring it off, she said.
(She's had five already, and nearly died of young George.)
The chemist said it would be all right, but I've never been the same.

میں کیا کروں وہ بولی ذرا منہ کو کھینچ کر/ ان گولیوں کا اثر ہے جو میں نے کھائی تھیں
(پہلے ہی اس کے پانچ تھے، مرمر کے تھے بچے)
''کیمسٹ بولا ٹھیک ہے، میں ٹھیک نہ ہوئی!''
(ویرانہ۔سطر 158۔161)

پانچ بچوں کا جننا اور خاوند کے لڑائی میں جانے کے بعد مانع حمل گولیوں کا استعمال، میرا اپنی تسلی اور تشفی کے لیے اُسے کہنا

When Lil's husband got demobbed, I said.....
I didn't mince my words, i said to her myself,
HURRY UP PLEASE ! IT'S TIME !

لیلیٰ کا شوہر لام سے آنے لگا تو خود/ لیلیٰ کو میں نے صاف کھرے طور پر کہا
جلدی کرو براہِ کرم! وقت ہو گیا! (ویرانہ۔ سطر 139۔141)

یہ پھر سیکس کرپشن بلکہ محبت کے زوال کا قصہ ہے

۔حقیقی محبت نہیں ہے بلکہ یہ محض فطری جبلت کی تکمیل کا وقت اور ذریعہ ہے ۔ پھر ''آتشیں خطبہ'' (The Fire Sermon) میں عیش وطرب کی محفلوں کے اجڑنے کا اشارہ ہے ۔ دریائے ٹیمز کے کنارے برپا ہونے والی ہنگامہ پرور محفلیں قصۂ ماضی بن گئیں ۔ شبوں کو گرمانے والی جل پریاں بھی چلی گئیں اور ان کے عاشق آوارہ تاجر بھی رفو چکر ہوئے ۔ اب تو وہاں کھڑکھڑ ہڈیاں (Rettle of bones)، کھلے دہانے کھل کھل کھل (Chuckle spread from ear to ear) اور لتھڑے پیٹ (Slimy belly) باقیات کے طور پر رہ گئے ہیں ۔ جنگ نے سب کچھ برباد کر دیا ہے ۔ اسی طرح ٹائپسٹ لڑکی تھکی ہاری آتی ہے ۔ ناشتے کے برتن دھوتی ، چولھا جلاتی ، کھانا گرم کرتی ، سوکھتے کپڑوں کو سمیٹتی ، تھکی ہاری ، بور ، پھر بھی ملنے آنے والے پھنسیوں والے جوان کو بہ دلِ نخواستہ بھگتاتی ہے:

The time is now propitious, as he guesses

The meal is ended, she is bored and tired,

Endeavours to engage her in caresses

Which still are unreproved, if undesired.

Flushed and decided, he assaults at once;

Exploring hands encounter no defence;

His vanity requires no response,

And makes a welcome of indifference.

ڈاکٹر صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

وقت ہے اب مناسب ، وہ بھی جان گیا / کھانا ختم ہے ، لڑکی بور تھکی بھی ہے / اب وہ اس سے پیار کی کوشش کرتا ہے ،

نہ وہ اس کو روکے ، نہ وہ چاہے ہے / جوش میں آکر وہ یورش کر دیتا ہے ! / اس کے بڑھتے ہاتھ کو کوئی روک نہیں

اس کی انخ کو کوئی رضا درکار نہیں / بے دل پن کو خوش آمدہی سمجھے ہے (ویرانہ ۔ سطر 235-242)

گویا محبت وحبت کوئی نہیں محض سیکس کی تشفی درکا رہے ۔ مترجم نے ان تمام مواقع (Situations) کا منظوم ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اس ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے ۔ اور ایسا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب مترجم اصل تخلیق کو اپنے اوپر وارد کر کے اسے اپنے ترجمے میں دوبارہ تخلیق کرے ۔ ڈاکٹر محمد خاں اشرف پوری نظم کو اپنے اوپر وارد کر کے تخلیقِ نو کے پراسس سے گزرے ہیں ۔ گویا انھوں نے ویسٹ لینڈ کو ترجمے سے بلند کر کے تخلیق کا درجہ دے دیا ہے ۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک مثال اور درج کروں گا ۔ اس بند میں ایلیٹ نے جنگِ عظیم اول کے سبب مختلف شہروں کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے ۔ فاضل مترجم نے اس بند کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اردو میں منتقل کر کے اس کی روح کو کشید کیا ہے ۔

What is that sound high in the air
Murmur of maternal lamentation
Who are those hooded hordes swarming
Over endless plains, stumbling in cracked earth
Ringed by the flat horizon only
What is the city over the mountains
Cracks and reforms and bursts in the violet air
Falling towers
Jerusalem Athens Alexandria
Vienna London
Unreal

یہ کیا صدا ہے بلندیوں پر ہوا کے اندر / مامتا ہے جو فریاد کر رہی ہے / نقاب پہنے ہجومِ آوارگاں وہ کیا ہے

وہ سرزمینِ بلانشاں پر ، شکستہ دھرتی میں لڑکھڑاتے / سپاٹ آفاق سے گھرے ، بس / وہ شہر کیا ہے پہاڑیوں کے جو اس طرف ہے

جو پھٹتا ، بنتا ہے ٹوٹ جاتا ہے اپنی اودی ہوا کے اندر / برج ہیں گرتے / یروشلم ہے وہ یا کہ ایتھنز ، سکندریہ ہے

وی آنا ہے یا کہ لندن / بے حقیقت

ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے نہ صرف پوری نظم کا ترجمہ بڑی ہنرمندی اور لیاقت سے کیا ہے بلکہ نظم کے عنوان کو بھی موزوں ترین لفظ میں ترجمہ کیا ہے ۔ ''ویرانہ'' ویسٹ لینڈ کا بہترین ترجمہ جس کو انتظار حسین نے اپنے انگریزی کالم (مطبوعہ ڈان 15 ستمبر ، 2013) میں نہ صرف سراہا ہے بلکہ پانچوں مترجمین کے ترجمہ کردہ عنوانات پر اس عنوان کو ترجیح دی ہے ۔

شاعری کا آغاز (Origin)

جارج تھامسن/مترجم: مصطفیٰ کریم (یو کے)

شاعری کا غذ اور قلم کا رشتہ ہے۔ اور یہ تحریری فن عام گفتگو سے بہت مختلف ہے چوں کہ اس پر کافی غور و خوض کرنا پڑتا ہے۔ زمانہءِ قدیم، قرون وسطےٰ اور آج بھی شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان ایسی فصیل نہیں ہے جو شاعر کی شاعری کو نافہم بنا دے۔ خاص کر اگر سامعین کسان ہوں۔ [مثال کے طور پر یہ گیت جسے ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر وہ کسان گایا کرتے تھے جو فرقہ وارانہ فساد میں ملوث نہیں ہوئے تھے۔

دو ملک بھاویں وکھ نیں
پنڈے وجالے لکھ نیں
یا
ایویں جھوٹ ماریں جو گیا
کون وچھڑے یار ملاوندا اے
دیکھ لو دونوں دھیریں
(ہیر رانجھا)
کلج توں اڈے لکھ نیں

شاعر کے یہ اشعار عام گفتگو سے مختلف ہیں لیکن یہ وہ گفتگو ہے جو شاعر اور اسکے سامعین کے درمیان ہو رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر کی شاعری منجھی ہوئی زبان ہے۔ [اس لیے جو کچھ اس نے کہا اس پر اس نے کافی محنت کی ہے۔ مترجم] شاعری کے سامعین بھی کسی حد تک شاعر ہوتے ہیں۔ اسی لیے بہت ساری بڑی شاعری گمنام ہوتی ہے۔ اور یہ ایک سے دوسرے فرد۔ ماں باپ سے بچوں تک اور عہد بہ عہد، رنگ بدلتی ہوئی سنی جاتی ہے پھر اس کی برجستگی ختم ہو جاتی ہے۔ گو اس کی نغمگی کسی حد تک برقرار رہتی ہے لیکن اسے ہم شعوری فن کا رتبہ نہیں دیتے۔ (مثلاً امیر خسرو کے وہ گیت جو شادی بیاہ کے موقعے پر اب بھی گائے جاتے ہیں۔ غالباً ان کی ہیئت وہ نہیں جو خسرو کے زمانے میں تھی۔ مترجم) ان گیتوں میں یہی کمی ہے۔ ان پر کسی ایک شخص کی انفرادی مہر نہیں ہے، چوں کہ اب یہ کسی ایک شخص نہیں بلکہ ساری کمیونیٹی یا جماعت کی میراث بن چکی ہے۔

اس کے برعکس شاعری کا وہ کام جو رہا ہے اور رہے گا، کہ وہ دنیا جو شعور میں آتی ہے اور اس دنیا کا جس طرح احساس ہوتا ہے شاعری اس احساس کو سحر زدہ کیفیت میں مبتلا کرتی ہے۔

اگر شاعری کا عام گفتگو سے موازنہ کریں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعری میں آہنگ، تخیلی، خواب زدہ اور سحر کی کیفیتیں ہوتی ہیں۔ ہماری شعوری زندگی میں وہ تمام عناصر معاشی، سماجی، تہذیبی، جو ہماری مخصوص انسانیت کو برقرار رکھتے ہیں وہ بہت متحرک ہوتے ہیں۔ اس لیے انفرادی فرق بہت نمایاں رہتا ہے۔ اسی لیے جس طرح ذہنی کاوشیں ایک فرد کو دوسرے سے مختلف بناتی ہیں اسی طرح، عام گفتگو، انفرادی اظہار کو نمایاں طور پر آزادانہ اظہار بناتی ہے۔ لیکن جب ہم سو رہے ہوتے ہیں، اور ہماری انفرادیت بھی معطل ہو جاتی ہے، تو وہ تمام احساسات اور حوصلے جو ہم سب میں موجود ہوتے ہیں، اور جنھیں جاگنے کے اوقات میں ہم نمایاں نہیں ہونے دیتے وہ خواب میں کہیں زیادہ ہموار ہو جاتے ہیں۔

شاعری خواب کی دنیا ہے۔ ایک بار پھر Yeats کے حوالے سے کچھ لکھنا مناسب ہوگا۔ آہنگ کا کام گہرے غور و فکر کو طول دینا بھی ہے۔ یعنی وہ وقفہ جو جاگنے اور سونے کے درمیان ہوتا ہے۔ اور یہ ہمیں سستی کی سی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے۔ جو ہمیں مختلف ذرائع سے ہوشیار بھی رکھتا ہے اور یہ عجیب سا حال جس میں ذہن دباؤ سے آزاد ہو جاتا ہے وہ علامتوں کے ذریعہ نمایاں ہوتا ہے۔

شاعری آہنگ کی وجہ سے خواب آور ہوتی ہے۔ اتنی خواب آور بھی نہیں کہ نیند آجائے۔ اگر ہم کسی بھی زبان میں بحر یا چھند کا تجزیہ کریں تو اس میں Monotony یعنی بے کیفی یا سستی اور ہوشیاری کا خلط ملط ملے گا۔ یعنی وہ کیفیت جو ہمیں وجد میں مبتلا رکھتی ہے۔ یعنی شاعری کا وہ مخصوص سحر جس میں جاگنے اور سونے کا عمل ایک عجیب سی دنیا میں لے جاتا ہے۔ اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ شاعر تخلیقی تحریک میں مبتلا ہے تو وہ دوسرے افراد کے مقابلے میں اسی لاشعور کی عجیب دنیا میں ہوتا ہے۔ وہ سائیکی کے اس ہنگامے یا مخصوص وجد میں بڑی آسانی سے آجاتا ہے۔ اس طرح وہ تمام تضادات اور اختلافات جو معاشرے سے اسے ہوتے ہیں ان سے اسے نجات مل جاتی ہے۔ حقیقت کی ناہمواریاں شاعر کی وجدانی کیفیتوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ جب وہ ایسی دنیا میں ہوتا ہے جس میں اس کی انفرادیت بڑی حد تک اس کے جاگنے کی کیفیت سے کم ہو جاتی ہے اور وہ ایک عام انسان کی سمجھ بوجھ کے قریب ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک عام انسان کے خیالات اور احساسات بھی شاعر جیسے ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ عام انسان شاعر کی طرح اپنے خیالات اور

احساسات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اور اسی لیے شاعر ان سب کو تخیل کی سطح پر اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔

And when man in his agony is dumb

I have God's gift to utter what I suffer

وہ یعنی سامعین یا قاری اپنے تشنہ خواہشات کی وضاحت نہیں کر سکتے اور نہ ہی اظہار کر سکتے ہیں۔ شاعر خود بھی وضاحت نہیں کر سکتا لیکن تخلیقی تحریک کی وجہ سے انھیں اظہار کر سکتا ہے۔ اس اظہار میں قاری یا سامعین کو اپنی خواہشات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ قاری جب شاعر کا کلام پڑھتا ہے یا سامعین جب اشعار سن رہے ہوتے ہیں تو وہ بھی اسی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن سے شاعر اپنی شاعری کی تخلیق کے وقت گذرتا ہے۔ وہ اسی تخیلی دنیا میں چلے جاتے ہیں اور ان کی تسکین ہوتی ہے یا دل ہلکہ ہو جاتا ہے۔

زمانہ ءِ قدیم میں شکاریوں کا سردار اپنے شکار کو مارنے سے پہلے دیگر شکاریوں کے سامنے نقلیں اتار کر رقص کے ذریعہ سراب اور حقیقت کو واضح کرتا تھا۔ وہ قدرت کے سامنے دراصل اپنے خوف کا اظہار کرتا تھا۔ اس طرح اپنے خوف پر قابو پانے کی اس کی کوشش ہوتی تھی۔ رقص کے بعد اس کے ساتھی خود کو بہتر شکاری محسوس کرتے تھے۔

شاعری میں ایسی ہی خوبی ذرا بلند سطح پر پائی جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ زمانہ ءِ قدیم کے بعد تہذیب یافتہ عہد میں انسان قدرت کے بہت سارے معمولات کو زیر کر چکا ہے۔ جس کی وجہ سے سماجی رشتوں میں بھی پیچیدگیاں آ چکی ہیں۔ زمانہ ءِ قدیم کے عہد کے انسانوں کی زندگی سادہ تھی، طبقوں میں بٹی ہوئی نہیں تھی۔ وہ کمزور لیکن متحدہ محاذ بنا کر قدرت کا سامنا کرتے تھے۔ تہذیب یافتہ معاشرہ کہیں زیادہ پیچیدہ، باثروت اور طاقتور ہے۔ جنگی بنا پر معاشرہ تقسیم ہو چکا ہے۔ اسی لیے معاشرہ اور قدرت کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے۔ جو اس سحر کی بنیاد ہے جس پر انسان اور قدرت کے درمیان تضاد کا غلاف رہتا ہے، اور یہی شاعری کی بنیاد ہے۔ (اس بیان کو اقبال کے اس شعر سے سمجھا جا سکتا ہے۔

تو بچا بچا کر نہ رکھ اسے یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں۔

مترجم)

شاعر وہی کارنامہ کر رہا ہے جو زمانہ ءِ قدیم میں شکاریوں کا سردار کرتا تھا۔ یعنی وہ اپنے سامعین یا قاری کو ایک بڑی حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہا ہے۔

زمانہ ءِ قدیم کا شاعر تنہا کام نہیں کرتا تھا۔ اس کے سامعین اس کا ساتھ دیتے تھے۔ ان کی حوصلہ مندی کے بغیر اس کا کام کرنا مشکل تھا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کا کام تحریری نہیں تھا۔ اس کی شاعری قرائت تھی۔ وہ اشعار برجستہ کہتا تھا۔ جونہی اس کی تخلیقی تحریک نمایاں ہونے لگتی تھی اس کے سامعین کا ردِعمل فوراً ظاہر ہونے لگتا اور وہ سراب یا وجدانی کیفیت میں ڈوب جاتے تھے۔ جب ہم کسی اچھی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں یا سنتے ہیں تو بہت متاثر ہونے کے باوجود اپنے ہوش وحواس نہیں کھوتے۔ زمانہ ءِ قدیم کے سامعین اپنے شاعر کی شاعری میں بالکل کھو جاتے تھے۔ میں نے ایسا سماں مغربی آئیرلینڈ میں اکثر دیکھا ہے۔ ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ارکا نام کا روسی دیہی شاعر (Minstrel) اونیگا (Onega) جھیل کے کسی جزیرے کی جھونپڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ خاموش ہو گئے۔ ارکا کھانسا۔ اس نے سر کو پیچھے کی جانب جھکایا اور بعد میں مسکراتے ہوئے اس نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ لوگوں کو بے صبر پا کر اس نے اچانک گانا شروع کر دیا۔ اس ضعیف گویے کا چہرہ بدل گیا۔ اس کے چہرے پر جو شرارت تھی وہ غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ بچوں جیسا معصوم ہو گیا اور اس پر تخلیقی تحریک کا تاثر چھا گیا۔ اس کی کبوتر جیسی آنکھیں پھیل کر چمکنے لگیں ان میں آنسو آ گئے۔ اور اس کے سیاہی مائل گالوں پر سرخی آ گئی۔ جو Ballad وہ گا رہا تھا اس میں ایلیا نام کے ایک جری اور شریف انسان کا ذکر تھا جس نے اپنے عوام کو ایک جابر ڈاکو نجات دلائی تھی۔ لیکن اب وہ برسوں سے ضعیفی کے باعث مفلوج ہو چکا تھا۔ اس کے نغمہ کو سن کر بعض سامعین کبھی مسکرانے لگتے اور کبھی ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو جاتیں۔ اور کبھی ان سے کراہنے کی صدا بلند ہوتی۔ جب تک گیت گایا جاتا رہا سارے سامعین گہری محویت سے سنتے رہے۔

یہ سارے سامعین جاہل تھے۔ پھر بھی شاعری ان کے لیے بے انتہا اہم تھی۔ ہم نے شیکسپیئر اور کیٹس پیدا کیا ہے اور وہ یقیناً ارکا سے کہیں بڑے شاعر تھے۔ لیکن ارکا جس طرح مشہور تھا ویسی شہرت شیکسپیئر اور کیٹس کو نہیں میسر آئی۔ اب روس سے وسط ایشیائی ملک کی جانب آتے ہیں۔ اور ایک سیاح سے ترکستان کے ایک شاعر اور اس کے سامعین کی بابت معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس واقعہ کو سیاح نے کچھ اس طرح بیان کیا:

میں جب اترک Etrek نام کی جگہ پر تھا تو میرے خیمے کے قریب ایک دیہی گویے (Minstrel) کا خیمہ تھا۔ ایک شام وہ ہم سے ملنے

کے لیے اپنے ساز کے ساتھ آیا۔ اس کے ساتھ آس پاس کے وہ نوجوان آئے جو اس کا گانا سننے کے متمنی تھے۔ شروع میں اس کا نغمہ حلق سے نکلتے گڑگڑاہٹ کی طرح تھا۔ جیسے جھنجھنا بج رہا ہو۔ ساتھ ہی وہ اپنے ساز کے تاروں کو ہلکے سے چھیڑتا۔ جیسے جیسے وہ جوش میں آتا گیا وہ ساز کے تاروں کو زور سے چھیڑنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس جنگ میں شدت آگئی جس میں وہ حصہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھی نوجوانوں کا جوش بھی اسی جیسا تھا۔ وہ اذیت ناک چیخیں مار کر اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھالنے لگے اور سر کے بالوں کو اس طرح نوچنے لگے جیسے کہ وہ اپنے خلاف جنگ کر رہے ہوں۔ یہ ترکمان شاعر اور اس کے سامعین سحر میں گرفتار تھے۔

جب ہم ملٹن، ڈانٹے یا ہومر کو پڑھتے ہیں تو اپنے آپ پر قابو رکھتے ہیں۔ ہمیں گمان ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم کے یونانی جب ہومر کی شاعری کا مطالعہ کرتے تھے تو ایسی ہی کیفیت ان کی بھی ہوتی تھی۔ لیکن یہ غلط تصور ہے۔ افلاطون کے ایک مکالمے میں ہومر کا ایک Minstrel قاری ہومر کی شاعری کی قرائت کا تاثر اپنے آپ اور اپنے سامعین پر اس طرح بیان کرتا ہے: جب میں کوئی الم ناک اشعار سنانے لگتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، اور جب میں کسی عجیب وغریب کارناموں سے بھرے اشعار سناتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، میرا دل تیز اور زور سے دھڑکنے لگتا ہے..... اور جب میں اپنے سامعین پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ان کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں اور نگاہوں میں وحشت۔ وہ اس خوشگوار خوشی میں گرفتار ہوتے ہیں جو الفاظ ان کے دلوں میں برپا کر دیتی ہے۔

ہم جب کہتے ہیں کہ شاعر تخلیقی تحریک میں گرفتار ہے تو اس بیان میں کوئی گہرائی نہیں ہے۔ جب کسی قدیم (Primitive) شاعر سے پوچھیں کہ تمہارے فن کا راز کیا ہے تو وہ کہے گا یہ خدا کا دیا ہوا عرفان ہے جس میں خدائی سانس لیتی ہے۔ ایک بار پھر ہم وسط ایشیا کا رخ کرتے ہیں۔ رادولف جو انیسویں صدی میں عوامی گیتوں کی اعلیٰ سمجھ بوجھ رکھتا تھا وہ انیسویں صدی کی ساتویں دہائی کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کرغستان کا ماہر منسٹرل (Minstrel) کسی بھی موضوع پر برجستہ گا سکتا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اس یا اس موضوع پر گیت سنا سکتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ یہ بالکل ممکن ہے چوں کہ خدا نے اس کے دل میں گیت کا تحفہ رکھ دیا ہے۔ بغیر میری تلاش کے خدا میری زبان پر شاعری کے الفاظ چن دیتا ہے۔ میں نے کوئی نغمہ نہیں سیکھا ہے۔ سب کے سب میری داخلی دنیا سے بلند ہوتے ہیں۔ Odessy (ہومر کی عظیم شاعری) میں Phemios نام کا منسٹرل کہتا ہے۔ میں نے خود اپنا فن سیکھا ہے چوں کہ خدا نے میرے دل میں ہر قسم کے نغموں کو سمو دیا ہے۔ اور Caedmon نام کا ایک اینگلو سیکسن شاعر نے لکھا ہے کہ فرشتے اس کے خوابوں میں آکر نظمیں سناتے ہیں۔

ہر جگہ قدیم افراد شاعر کو پیغمبر سمجھتے جس پر خدا کا کامل اختیا تھا اور جس کی شاعری اسی کی آواز میں ہوتی تھی۔ قدیم یونانیوں کے لیے ماورائی بشارت اور پاگل پن میں الفاظ کی وجہ سے کوئی فرق نہیں تھا۔ چوں کہ دونوں کیفیتیں تقریباً ایک جیسی تھیں اور جو خاص طور پر اس مستانہ رقص میں ظاہر ہوتیں جو Dionysus نام کے دیوتا کے طریق عبادت میں عیاں ہوتا۔ میں پھر افلاطون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں:۔

''ہر اچھا شاعر شاعری کسی فن سے نہیں سیکھتا۔ بلکہ اس کی شاعری ماورائی یا خدا کے قابو میں ہونے کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ جب وہ شاعری خلق کر رہا ہوتا ہے تو اس کی حالت Koryhantes رقاصوں جیسی ہو جاتی ہے۔ جوں ہی اس کی شاعری میں آہنگ کی کیفیت آنے لگتی وہ Bacchants کی طرح پاگل ہونے لگتا جو اپنی دیوانگی میں چشمے سے دودھ اور شہد نکالتی ہیں۔''

Koryhantus قدیم یونان کے وہ درویش تھے جو وجد میں قدیم ترکی کی ایک دیوی کے سامنے رقص کرتے تھے۔ (آج بھی ترکی کے شہر کونیا میں رقاص درویش مولانا رومی کے مزار کے قریب مخصوص دنوں میں والہانہ رقص کرتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مترجم) Dionysus کی مرید عورتوں کو Bacchants کہتے تھے جو موسیقی کے زیر اثر ہسٹریا جیسی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی تھیں جس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان میں خدا آگیا ہے۔ اب یہ مان لیا جا سکتا ہے کہ شاعری کی جڑیں سحر میں پیوست ہیں۔ (زمانہ قدیم یعنی Monotheist مذاہب کے آغاز سے پہلے مذہبی امور اور سحر طرازیوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ آج بھی خاص کر سندھ میں بعض بزرگوں کے مزار کے سامنے مرد عورتیں دیوانہ وار رقص کرتے نظر آسکتے ہیں۔ اگر وہ کچھ پڑھ رہے ہیں یا گا رہے ہیں تو اسے شاعری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم)

تخلیقی تحریک اور جنونی کیفیت ایک ہی جیسی ہیں۔ قدیم معاشرے میں دیوانگی کا ہونا اور جسم کا اکڑنا (جس طرح مرگی میں ہوتا ہے۔ مترجم) خدا کے

قابو میں آجانے سے معنون کیا جاتا تھا یا کسی بدروح یا کسی جانور کے قبضہ میں آجانے کی وجہ سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ نتیجہ اس بے پایاں مسرت سے اخذ کیا جاتا تھا جو بھیس بدل کر رقاص رقص کرتے وقت محسوس کرتے تھے۔ اس طرح کے رقص میں وہ اس جانور کا روپ اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے جو ان کے رقص کا موضوع ہوتا تھا۔

ہسٹریا ایک قسم کا اعصابی دباؤ ہے۔ جس میں ایک فرد کا تضاد اپنے ماحول سے ہوتا ہے۔ اور جس سے لاشعور کی بغاوت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ وحشیوں یا جاہل قوموں کے افراد میں عام ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس مرض کے لیے کمزوری رکھتے ہیں بلکہ اس کی وجوہات شعور میں کم گہرائی کا ہونا اور اپنی فطرت کا کم لچکیلا ہونا ہیں۔ اس کا علاج جادو سے (وحشیوں کا) کیا جاتا ہے۔ جوں ہی ہسٹریا کا آغاز ہوتا ہے مریض کے قریب معالج گیت گاتے ہیں جس کی وجہ سے مریض پر بیہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ذہن میں جو نفسیاتی الجھنیں ہیں وہ رفع ہونے لگتی ہیں۔ اس منزل پر شاعری اور جادو ایک ہی سطح پر ہیں۔ بلکہ یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ شاعری نے دوا کا کام کر دیا۔ مریض اگر کسی جادو (ہسٹریا کی ایک وجہ مریض کا کسی جادو میں گرفتار ہونا بھی کہا گیا ہے۔) کے زیر اثر تھا یا کوئی بدروح اس میں سمائی ہوئی تھی یا کوئی جانور اس میں ہلول کر گیا تھا تو گیت یا شاعری نے اسے دور کر دیا۔ زمانہ ءِ قدیم کے یہ معالج باضابطہ علاج کرنا سیکھتے تھے۔ وہ اس جانور کا بھیس بنا کر رقص کرتے اور گاتے تھے جسے وہ مریض پر قابض سمجھتے تھے۔ یعنی معالج اور مریض کے درمیان وہی رشتہ ہے جو زمانہ ءِ قدیم میں شکاریوں کے سردار اور اس کے ساتھیوں کے درمیان تھا۔

کسی فرد کا مکمل طور پر قبضہ میں آجانے کے بعد کی منزل بشارت دینا ہے۔ جس مریض کو جادو کے اثر سے بہتر کرتے ہیں' اس سے جادوگر اکثر اس کا نام پوچھتے ہیں۔ جواب ملنے پر وہ بھوت پریت اپنے مریض کو نجات دینے سے پہلے جادوگر سے خوشنودی طلب کرتا ہے۔ اس طریقے سے خدا کی مرضی کا بر آنا اور مستقبل کی بابت اطلاع ملتی ہے۔ مرگی کا دورہ پیغمبرانہ سحر زدہ کیفیت (trance) ہے جس میں اکثر پیشگوئیاں سنی جا سکتی ہیں۔

جس کی وجہ سے زمانہ ءِ قدیم میں اسے خدا یا بھوت پریت کی گفتگو سمجھتے تھے۔ اس گفتگو میں ان کا خوف' امیدیں' مستقبل کی بابت آرا الغرض وہ تمام بیانات ہوتے تھے جو ہوش و حواس کی حالت میں بولے نہیں جاتے تھے۔ ہم اب بھی کہتے ہیں کہ آج کے حالات پر ماضی میں سایہ پڑ چکا ہے۔ اس کا اثر زمانہ ءِ قدیم کے افراد کے لاشعور پر ہوتا تھا جو انھیں عجیب سی بے چینی میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اور جو شاعران کی نگاہ میں پیغمبر ہوتے تھے ان کے لاشعور سے یہ سب کچھ شعور میں آجاتا تھا۔ (زمانہ ءِ قدیم کو جانے دیجیے غالب کے اس شعر پر غور کیجیے۔

سیکھے ہیں ہم مہ رخوں کے لیے مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

مہ رخ جادوگر ہی ہو سکتا ہے جس نے غالب کے لاشعور میں ہلچل مچا دیا اور وہ اس شعر کو کہنے پر مجبور ہو گئے۔ مترجم)

زمانہ ءِ قدیم کے افراد کے ذہن میں بشارت دینے اور شاعری میں کوئی فرق نہیں تھا۔ عہد قدیم کا عظیم یونانی شاعر ہومر کی شاعری میں منسٹرل (Minstrel) ایک خاص نگاہ رکھتے تھے (جو دوسروں کو میسر نہیں تھی) اور انھیں مقدس مقام حاصل تھا۔ شاعر کی سائیکی کا ہلچل اسے فنتاشیہ کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جس میں اس کے لاشعور کے ہنگامے نغمہ بن کر اور آہنگ سے سجے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ شاعر کی پیشگوئیاں قابل احترام سمجھی جاتی ہیں اس لیے ،وہ ہمارے دلوں کو گرم کر دیتی ہیں۔ ان خیالات کو گوئٹے نے اپنی شاعری میں محترم بنا کر پیش کیا ہے۔

Nature has left us tears, the cry of pain

When man can hear no more, and most of all

To me she has left my melody and speech

To make the full depth of my anguish known;

And when man in his agony is dumb

I have God's gift to utter what I suffer

شیکسپیئر کے علاوہ گوئٹے آج کے یورپ کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اپنے ان الفاظ میں اس نے شاعر کے کام کو بیان کر دیا ہے۔

اُردو ناول کے رنگ

پروفیسر جمیل آذر

ڈاکٹر انور سدید اُردو ادب کے ان چند ناقدین میں سے ہیں جن کی ادب سے گہری وابستگی ہے۔ مگر ان سب سے نمایاں وصف جو انور سدید کے ہاں مجھے نظر آتا ہے وہ ان کی ادب سے محض وابستگی ہی نہیں بلکہ ادب ان کی زندگی ہے اور ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ شاید ہی کوئی اردو ادب کی کتاب یا مجلّہ ایسا ہو جو اُن کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ نئی کتابوں پر ہفتہ وار تبصرہ، ادیبوں کی شخصیت پر مضامین اور وفیات پر لکھنا ان کا روزمرہ کا معمول ہے۔ وہ انتہائی زود نویس اور بے پناہ پڑھنے والی شخصیت ہیں۔ اس پر لطف یہ کہ نہ صلہ کی تمنا اور نہ ستائش کی پرواہ۔

وہ کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نقاد شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ ان تمام اصناف ادب پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''اُردو ناول کے رنگ'' میں انہوں نے انیس (۱۹) معرکہ آرا ناولوں پر بڑا جامع اور خوبصورت تجزیہ پیش کیا ہے جنہیں پڑھ کر ہمیں اُردو ادب میں ناول جیسی عظیم صنف ادب کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ ان ناولوں کے گراں قدر تجزیوں میں ڈاکٹر احسن فاروقی کے تین ناول ''شام اودھ، سنگم اور دل کے آئینہ میں'' جوگندر پال کے دو ناول ''خواب رو اور نادید'' بانو قدسیہ کے دو ناول ''راجہ گدھ اور حاصل گھاٹ'' غلام الثقلین کا ناول ''میرا گاؤں'' فرخندہ لودھی کا ''حسرتِ عرضِ تمنا'' نثار عزیز بٹ کا ''نے چراغے نے گلے'' وب سدید کا ''بیاضِ سحر'' سلمٰی اعوان کا ''تنہا'' انیس ناگی کا ''سکریپ بک'' محمد سعید شیخ کا ''ایک اور دریا'' محمد عاصم بٹ کا ''دائرہ'' اصغر بٹ کا ''ٹوٹی کہاں کمند'' صلاح الدین عادل کا ''مصائب و آفات کو امام کیا'' یونس جاوید کا ''ستونت سنگھ کا کالا دن'' اور نجم الحسن رضوی کا ''مرجینا اور ماروی'' شامل ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا مقدمہ بھی ڈاکٹر انور سدید نے خود ہی سپردِ قلم کیا ہے جس سے کتاب کی افادیت دوچند ہو گئی۔ انہوں نے نہ صرف ناول نگاری کی تاریخی حیثیت کو یونانی، اطالوی، یورپی ادب سے لے کر مشرقی ادب بالخصوص برصغیر تک کا بھرپور جائزہ پیش کیا بلکہ ناول کی تعریف کو معتبر ناقدین کی آرا کے حوالے سے بھی نقاب کشائی کی۔ ابتدا میں اصطلاحات کے حوالے سے کہتے ہیں ''راجر فاؤلر نے جدید تنقیدی اصطلاحات کی ایک لغت (A Dictionary of Modern Terms) میں اصناف ادب کی درجہ بندی کی تو ناول کو شاعری اور ڈرامے کے بعد تیسرا مقام دیا لیکن ناول کو ادب کی تین اہم اصناف میں شمار کیا جو سب سے بعد میں معرضِ تخلیق میں آیا اور جس کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم بعض ناقدین نے اپنے اپنے تجربہ، مشاہدہ اور مطالعہ کے نتیجہ میں ناول کی تعریف ضرور بیان کی ہے۔ مثلاً ای۔ ایم فاسٹر کے نزدیک ناول کے لیے پلاٹ کا ہونا ضروری ہے جس میں کہانی کی بنت، کرداروں کا عمل اور ردِعمل جلوہ پیرا ہوتا ہے۔ والٹر ایلن کے نزدیک ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ ''واقعات ایک دھاگے میں سلسلہ در سلسلہ بندھ ہوتے ہیں اور یہ ناول کے ہیرو کے کردار کی مختلف صورتوں کو ابھارتے ہیں۔'' یہاں والٹر ایلن + ای ایم فارسٹر کے نزدیک سے جس بات کو فارسٹر نے پلاٹ کہا ہے ایلن نے اسے دھاگہ کہا ہے۔ ڈی۔ ایچ لارنس کے نزدیک بقول انور سدید ''ایک ناول انکشافِ حیات کا مکمل وسیلہ ہے'' ان سب آراء کی روشنی میں ڈاکٹر سدید یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں ''بلاشبہ ناول زندگی کی رنگ بدلتی قوسِ قزح اور حقیقت کی باریک ترین جزئیات کو صداقت اور جرات سے پیش کرنے کا فن ہے لیکن یہ زندگی کا ہو بہو چربہ نہیں۔'' ناول کے تاریخی ارتقا میں وہ سب سے پہلے ہسپانوی شہرہ آفاق مصنف سروینٹیز (Cervantes) کا ذکر کرتے ہیں۔ ''سروینٹیز نے ''ڈان کہوٹے'' (Don Quixote) لکھ کر اس صنف ادب کے ارتقا میں نہ صرف گراں قدر حصہ لیا۔ بلکہ حقیقت کو فنطاسی (Fantasi) میں مدغم کرنے کی کاوش بھی کی۔'' ابتدا میں تاریخی ناول لکھے گئے جن میں فنطاسی کا بھرپور استعمال ہوا۔ نسیم حجازی، رئیس احمد جعفری، قیسی رامپوری، صادق صدیقی، سردھنوی اور ایم اسلم نے تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا۔ بعدازاں قرۃ العین حیدر نے آگ کے دریا میں، آخر شب کے ہم سفر اور چاندنی بیگم جیسے ناول تاریخی پس منظر میں سپردِ قلم کیے۔ اسی طرح شمس الرحمان فاروقی نے اپنے ناول ''کئی چاند تھے سر آسمان'' میں ''تاریخی تناظر اور حقیقی کرداروں کی معاونت سے ایک خاص دور کی تہذیبی بازیافت کی۔ ان سب ناول نگاروں نے تحیر کی فضا کو اپنے اپنے انداز میں قائم رکھا۔ اپنے گراں قدر مقدمے کے بعد وہ انیس (۱۹) ناولوں کا اس خوبصورتی سے جائزہ پیش کرتے ہیں کہ قاری اُن سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنے ذہن میں ناول کی کئی شمعیں روشن ہوتی پاتا ہے۔ یہی ''اُردو ناول کے رنگ'' کا کرشمہ ہے۔

طویل اور مبسوط مقدمہ کے بعد وہ انیس (۱۹) ناولوں کا اختصار کے ساتھ نہایت معلومات افزا تجزیہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے ناول شامِ اودھ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ڈاکٹر احسن فاروقی نے اس تہذیبی کہانی کو معاشرے کے باطن سے دریافت کیا ہے اور اس کی متنوع جزئیات کا تانا بانا اس خوبصورتی سے تیار کیا ہے کہ ابتدا سے لے کر اختتام تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ انہوں نے نواب ذوالفقار علی خان کو اودھ کی تہذیب کی علامت بنایا تو نواب حیدر اور انجمن آراء کی معاونت سے اس تہذیب کے تمام نقش و نگار اس کے اصلی رنگوں میں اُجاگر کر دیے۔ اودھ کی مخصوص تہذیب اور اس کے عروج و زوال کو مصنف نے نہایت چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اودھ کی تہذیب جو کبھی عجوبہ روزگار اور نمونہ گل و گلزار تھی خاکستر ہوتے دکھایا ہے اور پھر نو آبادیاتی نظام نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ یہ تاریخی سبق آموز ناول ہے۔ پریم چند نے معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی و طبقاتی اُلجھنوں کو اپنے

ناولوں میں موضوع بنایا اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کی اور ناول میں ارضی حقیقتوں کو واشگاف کیا تو احسن فاروقی نے بلند پایہ تہذیب کی زوال اور پستی کی داستان رقم کی۔ ان دونوں ناول نگاروں نے رومانیت سے نکال کر زمینی حقائق سے ناول کو روشناس کیا۔

ڈاکٹر انور سدید اُن کے دوسرے ناول سنگم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ''ڈاکٹر احسن فاروقی نے تاریخ کے تناظر کو اس طرح بلاوجہ کام میں لانے کی بجائے برصغیر میں مسلمانوں کی نو سو سال یعنی ۱۰۲۳ سے لے کر ۱۹۶۲ تک کی تاریخ کے جوہر سے استفادہ کیا اور ان تہذیبی، سماجی اور اخلاقی قدروں کو سمیٹنے کی کوشش کی جو برصغیر میں ہندوستانی اور اسلامی تہذیب کی آویزش و آمیزش سے رونما ہونے لگی تھی۔'' ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ''مسلم'' کے اہم ترین کردار کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''گنگا جمنا کا دوآب خواب کی دنیا تھی، سنگم خواب کی لکیر تھی۔ وہ اس خواب میں گم ہونے کے لیے آیا تھا۔ اس میں گم ہوتا گیا تھا..... کیا سہانا خواب تھا..... سہانا خواب؟ ہاں خواب کا پہلا حصہ سہانا ضرور تھا مگر آخری حصہ خواب پریشاں تھا۔ ۱۰۲۴ سے ۱۹۶۲ تک ۹۱۸ برس لمبا خواب مگر یہ خواب کل پانچ ایکٹ کا ڈرامہ تھا۔ اس میں جو وقت لگا تھا وہ یونانی ڈرامے کے چوبیس گھنٹوں کے برابر تھا۔ اس کی زندگی کے چوبیس گھنٹے عام زندگی کے ۹۱۸ برس کے برابر تھے۔ مسلمانوں کی بنیادی غلطی آسائش اور عیش و عشرت کی زندگی تھی جس کا خمیازہ ہندی مسلم آج تک بھگت رہا ہے۔ یہ ناول چشم کشا ہے۔''

''دل کے آئینہ میں'' احسن فاروقی کا تیسرا ناول ہے جس کا ڈاکٹر انور سدید نے نہایت خوبصورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید ''سنگم کا موازنہ بالعموم قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' سے کیا جاتا ہے'' بقول انور سدید صاحب یہ موازنہ موضوع اور نقطہ نظر کے لحاظ سے مختلف ہے۔ البتہ ''لاشعوری رو'' کی ٹیکنیک کے اعتبار سے صحیح ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناول کی ابتدا گوتم بدھ کے زمانے سے کی اور اسے پاکستان کے ابتدائی دور تک لے آئیں۔ ان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی میل جول کو نمایاں کرنا اور پھر علیحدگی کے نتائج کی طرف لانا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے یہ کام خالص دانشوری کی سطح پر کیا اور ان اثرات کو زیادہ نمایاں کیا جو انہوں نے ہندوستان کے اونچے درجے کے سرکاری اور سماجی تناظر سے مشاہدہ کیے تھے۔ چنانچہ ان کے حل کا عمل مختلف ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر احسن فاروقی نے ''سنگم'' اسلام کے پس منظر میں لکھا اور اسے مسلمانوں کی تاریخ سے منسلک کرنے کی کاوش کی۔ اس میں اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کی اخلاقیات اور انسانیت کی اقدار کو منور کرنے کی سعی کی۔ اس طرح ڈاکٹر انور سدید نے ان دو عظیم ناول نگاروں کے نقطہ نظر کو بڑی گہری نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ عجیب بات ہے یہ ناول کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ صرف ۱۹۷۷ کی دہائی میں قسط وار سہ ماہی ''سیپ'' کراچی میں شائع ہوا تھا۔ یہ ڈاکٹر انور سدید کی ادب دوستی کی دلیل ہے کہ انہوں نے قسط وار ناول کا بھی تجزیہ پیش کر دیا۔ جوگندر پال کے ناول ''خواب رو'' پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں ''خواب رو'' میں جوگندر پال نے پاکستانی ادیبوں سے کہیں زیادہ پاکستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے..... اس نے مہاجرت کے مسئلے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش نہیں کی۔ پاکستان اور بھارت کے باشندوں کی ہجرت اور نقل مکانی ۱۹۴۷ء کی آزادی کا ایک بدیہی نتیجہ تھا جسے فرقہ پرست سیاسی راہنماؤں نے ہوا دی اور اب تک ہوا دے رہے ہیں۔ جوگندر پال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور اپنی مرزبوم سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نویس ہیں لیکن خواب رو اور نادید جیسے خوبصورت ناول سپردِ قلم کرنے کے بعد انہوں نے اپنی تخلیقی کاوش کا لوہا اس صنفِ ادب میں بھی منوایا۔ بلند مرتبہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو بظاہر اندھا ہونے کے قدرت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

راجہ گدھ اور حاصل گھاٹ بانو قدسیہ کے دو بلند پایہ ناول ہیں۔ جب انسان کے اندر حرام اور حلال کی تمیز ختم ہو جاتی ہے تو وہ راجہ گدھ بن جاتا ہے۔ اس ناول کے حوالے سے بانو قدسیہ نے بڑی شہرت پائی۔ ڈاکٹر انور سدید اس ناول پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''راجہ گدھ کا واحد متکلم قیوم اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ جس کی زندگی میں سیمی شاہ، عابدہ، امتل اور روشن وغیرہ نسوانی کردار آتے ہیں اور اس کے گدھ روپ کو آشکار کرتے ہیں۔'' انور سدید صاحب اس ناول کی نظریاتی جہت کا پہلو پروفیسر سہیل کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ پروفیسر سہیل اس ناول پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں ''جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی جینز (Genes) کو متاثر کرتا ہے..... رزق حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہے۔'' اس ناول میں چند دانشورانہ جملے موتیوں کی طرح جگمگاتے ہیں ڈاکٹر انور سدید نے چند جملے ہماری طبع خاطر کے لیے پیش کیے ہیں۔

(۱) ''مانگی ہوئی محبت کا مزا بگڑی ہوئی شراب جیسا ہوتا ہے۔''

(۲) ''بزدلی بھی بہادری ہی کا دوسرا روپ ہے، بہادری حق مانگنے میں نہیں، حق چھوڑ کر نکل جانے میں ہے۔''

(۳) ''علم سے نکلنے والی سوچ ریگستان میں جا کر سوکھتی ہے۔ وجدان سے جنم لینے والی سوچ باغ کو دہانے پر لے جاتی ہے۔''

یہ ضخیم ناول ۴۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''راجہ گدھ کا بیانیہ جو ۴۵۲ صفحات پر محیط ہے زندگی کی متعدد ابعاد جن میں خیر و شر، نیکی اور بدی، نیک نیتی اور بدنیتی، روحانیت، مادیت اور دنیت اور خود غرضی اور عالی ظرفی کے ان گنت موضوعات، سوالات کی صورت میں موجود ہیں۔'' راجہ گدھ بقول ڈاکٹر انور سدید اُردو ادب کا ایک منفرد اور بے حد اہم ناول ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے دیگر ناولوں کا تجزیہ بھی اسی طرح عرق ریزی سے کیا ہے۔ ان کے تجزیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصل ناول کا فکری، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی پہلو قاری کے سامنے اُجاگر ہو جاتا ہے۔ اُن کا اسلوب نگارش انشائی بہ الفاظِ دیگر تخلیقی ہے۔ قاری کو کہیں اُلجھن کا شکار نہیں ہونا پڑتا۔ ادب کے طالب علم کے لیے یہ ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ اسے مقبول اکیڈمی لاہور نے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یادوں کے دیپ لیے

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا / بہاولپور

جس طرح ہر لکھنے والے کا ایک اپنا اپنا انداز، اپنا مزاج یا اسلوب ہوتا ہے۔ بعینہٖ ادریس احمد آفتاب بھی لکھتے وقت اپنے مختلف ذہنی، قلبی یا تجرباتی میدان کے حصار کے تابع نظر آتے ہیں۔ وہ عظمت حوا کی مناسبت سے اپنا مدعا بیان کرتے وقت تاریخی جھروکوں سے جھانکتے ہوئے چند ایک ان عظیم خواتین کی مثالیں ضبط تحریر میں لاتے ہیں جنہیں کئی حوالوں سے ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ پھر وہیں ان کی نظریں بی بی سی اردو ڈاٹ کام کی رپورٹ سے دوچار ہوتی ہیں تو وہ اس رپورٹ کو من وعن شامل کر کے پڑھنے والوں کو ان احساسات وخیالات سے روشناس کراتے ہیں جن سے وہ خود گزر رہے ہوتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ انسان کا تجربہ، مشاہدہ اور ماحول اس کی تحریر کی نفسیاتی بُنت میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی بہت سی وارداتیں ذہنی و دماغی یا قلبی ان پہ بھی اثر پذیر دکھائی دیتی ہیں۔ ایک باب کے حصہ میں آپ محبت کے مختلف مدارج کا ذکر کرتے ہوئے اس سے متاثر افراد کی درجہ بندی کے ساتھ ساتھ انہیں علاج معالجہ کی ضرورت کی تجویز دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ کام بظاہر معمولی سہی لیکن اس کی چھلنی سے گزرنا یا فلٹریشن کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ سچ تو یہ کہے کہ کبھی کبھار مجھ ایسے تجزیہ نگار کو یہ کہنا پڑ جاتا ہے کہ اس قدر باریک بینی سے معاشرہ میں ہونے والی اونچ نیچ پہ نظر رکھنے والا تخلیق کار اس سے بھی کہیں زیادہ جزئیات نگاری کے بعض پہلوؤں کی تہہ تلک پہنچتا ہے۔ جبکہ کئی صورتوں میں اچھے بھلے واقعات سے پہلوتہی کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔

تاہم اس قسم کی باریک اور موٹی چھلنی یا معاملات کی اس انداز سے فلٹریشن کرنا ایک زیرک لکھاری کی بڑی کامیابی ہوا کرتی ہے اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ جب بندہ خود ان کیفیات سے لطف اندوز ہونے کے وسیع تجربے کا حامل ہو۔ یہ بات اس لیے بھی قرینِ قیاس ہے کہ جس عمل سے انسان خود نہ گزرا ہو، اس عمل کی تفسیر میں جاذبیت کا عنصر عنقا ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک ادریس احمد آفتاب کے اس کتاب میں پیش کردہ مضامین کا عمومی تاثر یہ بنتا ہے کہ جیسے انہوں نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے قریب قریب تمام تلخ و شیریں واقعات میں سے نچڑتے احساسات کو الفاظ کا روپ دے دیا ہو۔ ان کے نزدیک جذباتی استقامت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رومانوی فلسفہ ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ذرائع ابلاغِ عامہ اور رومانوی ادب اس فلسفہ کو سب سے زیادہ ہوا دینے والے فیکٹرز ہیں۔ جس کے سبب انسانی دماغ کا وہ حصہ خاص طور پر زیادہ متاثر ہوتا ہے کہ جہاں منطق اور سوچنے کے خلیات پنپ کر ردِ عمل ہوتے ہیں۔ وہ اس نوع کے فلسفہ کو اس لیے بھی رد کرتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ایسی صورت میں انسان بہت خود غرض (Self Centered) یا تصوراتی اور مصنوعی دنیا (Self Created) میں ہی کھویا رہتا ہے۔ نتیجتاً اس کی حقیقی دنیا کا رنگ دھندلا سا جاتا ہے۔ اس حقیقی اور خود ساختہ کائنات کی آنکھ مچولی کے ضمن میں وہ ایک تحقیقی رپورٹ سے استفادہ کے بعد رپورٹ مرتب کرنے والی شخصیت کا شکریہ ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ہم ادریس آفتاب کے ان خواص کو سراہ سکتے ہیں جن میں وہ خیالی باتوں پر اکتفا کرنا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی مانگے تانگے کے مضامین کا چربہ پیش کرنے کی روش اختیار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ تحقیقی اور عملی زندگی کے قائل ہیں۔ اپنی اس سوچ کے حق میں اپنی تحریر کو ٹھوس حوالوں سے آراستہ و پیراستہ بھی کرتے ہیں، جس سے نفسِ مضمون کو سمجھنے میں کما حقہ قاری کو آسانی میسر آتی ہے اور اس سے حقیقت پسندی کے بہت سے در بھی وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ایک اور بات بھی محسوس ہوتی ہے کہ ادریس آفتاب اپنے مضامین یا تحریر پیش کرنے کے معاملے میں خود اپنے منصف کا کردار بھی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ایک چابک ریفری کی طرح وسل اُٹھا کے معاشرے میں ہونے والے فاؤلز پر زوردار سیٹی بجا کر متنبہ ہی تو کر سکتے ہیں اور ان کی تحریریں اس بات کی غماض ہیں اور کبھی کبھار وہ اپنے پیش کردہ خیالات، نظریات، احساسات اور اعتقادات المختصر تخلیقات کی تکمیل پر خود ہی اپنا (Open Defense) مجلسی دفاع کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

آئی اے آفتاب عمومی زندگی اور تصنیفی لمحات میں ہر چند دونوں صورتوں میں سوالات اُٹھانے کی دعوتِ عام دیتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ سوال کو پیش نہ کرنے کی صورت کو بھلا نہیں گردانتے۔ شاید وہ یہ جانچنے کی کوشش کرتے ہوں کہ ان کے تخلیقی مواد کو اہداف نے کس طرح جانا یا پہچانا۔ وہ ''جارج آرویل کے ابلاغی ماڈل'' کے آخری حصہ فیڈ بیک کو موثر ابلاغ

کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں۔ ایک باب میں ادریس احمد آفتاب اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر قدیر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خاصے غصہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ چونکہ آپ کی پہلی تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' جو خودنوشت یا آپ بیتی پر مشتمل ہے، اس سے آپ کی اپنے بھائی سے مخاصمت کا ان ہی کے منہ زبانی علم ہوتا ہے۔ جبکہ زیرِ نظر حصہ دوم کے ایک باب میں آپ پھر سے اپنے بھائی کے خلاف بھڑک اُٹھتے ہیں اور یہاں بھی اپنے بڑے بھائی کے ان پر ڈھائے جانے والے مبینہ ظلم و استبداد کے تناظر میں ایک معقول جماعت کو بھی خوب رگیدتے نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ برے کی ہر ادا ہی بری لگتی ہے۔ شاید اسی سبب انہیں بھی اپنے برادر کلاں سے وابستہ یا ان سے جڑی ہر شے زہر دکھائی دیتی رہی ہے۔ اسی عمل کو انسان کے تجرباتی میدان کا نفسیاتی دائرہ کار کہا جاتا ہے۔ مثلاً اگر مسجد میں سے جوتی غائب ہو جائے تو اس کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں ہوگا کہ نمازی چور ہیں۔ بلکہ اس کا معنی یوں بنتا ہے کہ چور مسجد میں گھس آیا تھا۔

زیر نظر تصنیف دراصل ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی یادداشتوں کے حصے کی دوسری قسط ہے۔ یہ ایک ایسی روئیداد ہے کہ جس میں بہاول پور کے دور دراز علاقوں اور اس میں موجود بعض حوالوں کی تاریخی اعتبار سے بعض بڑے مزے کی معلومات ملتی ہیں۔ چونکہ بعض واقعات کے ہم سب چشم دید گواہ تو ہوتے ہیں لیکن بوجوہ اسے ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام نہیں کر پاتے۔ جب کہ ادریس احمد آفتاب اپنے فرسٹ ہینڈ نالج یا Information کے روپ اور چند ایک جگہوں پر سیکنڈ ہینڈ معلومات کے سروپ کا نقارہ بجاتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس کتاب میں جا بجا واقعات نگاری، ڈرامائی یا افسانوی اندازِ تحریر قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کا باعث بنتا ہے۔ متنوع موضوعات بھی کتب بینی کے عمومی فروغ جبکہ اس تصنیف کو خاص طور پر پڑھنے کے رجحان کا باعث بن رہے ہیں۔

سرورق سے لے کر ورق ورق گردانی کے لیے جن معیارات کی ضرورت ملحوظ رکھی گئی ہے، وہ اس کتاب کی صورت میں ایک بھرپور گفٹ پیکیج محسوس ہو رہا ہے۔ جہاں کہیں سولہ سنگھار ہیں تو کہیں یہ خوشبودار لذیذ پکوانوں کے بیچوں بیچ چٹ پٹاہٹ، شیرینی اور کہیں مرچیلے پن کے ذائقوں سے منہ میں پانی بھر آنے کے لیے کافی وشافی ہے۔ اس تحریر سے قاری کا ہر بات سے متفق ہونا بنتا ہے یا نہیں اس بات سے قطع نظر ادریس احمد آفتاب نے جیسا محسوس کیا یا اپنی زندگی کی اونچ نیچ کے تجربات سے جو کچھ کشید کیا، اسے پوری جرات کے ساتھ ہمارے سامنے لا کے رکھ دیا ہے۔ 16 ابواب پر مشتمل یہ داستان شوخی، سنجیدگی، خوشی، غمی، ہنسی، مذاق اور شب و روز کی کارگزاری پر ہی منتج نہیں ہو جاتی بلکہ کم و بیش پون صدی پہ مشتمل آنکھوں دیکھے احوال کا ایسا قصہ ہے کہ جس میں ''تاریخیت'' جھوم جھوم کر اپنا رقص ہمارے سامنے کرتی ہے تو اس رقص میں ہم سب کو کہیں نہ کہیں اپنا عکس تلاش کرنے کا موقع مل ہی جاتا ہے۔

یوں یہ یادداشت ہم سب کے پہلو بہ پہلو چمکتی، مہکتی، گنگناتی، بل کھاتی، ندی معلوم ہوتی ہے۔ یہی اس تحریر کی کمال خوبی اور حُسن ہے جہاں آ کر ہمارا دل لکھاری کا ماتھا چومنے کو مچلتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کروا رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم سب کا ناسٹلجیک پوائنٹ آف ویو ایک ہی نکتہ پر آ کے مرکوز ہوتا ہے۔ یہی نکتہ آفرینی اور آپس میں سوچوں کے ملاپ کی انتہا کہی جا سکتی ہے۔

❀❀❀

غلام اصغر طاہر

کس طرح غم کو آشکار کریں
اب تیرے بعد کس سے پیار کریں

زخمی زخمی وجود کر کے اب
دوست حیراں ہیں کس پہ وار کریں

کس دوراہے پہ لا کے چھوڑ گئے
کون سی راہ اختیار کریں

کس کو دعویٰ ہو پارسائی کا
بس یہ آنکھیں گناہگار کریں

عشق دیوانگی ہے عقل کہے
دل پکارے کہ بار بار کریں

بہ یاد: سید قاسم محمود
شاہکار علمی، ادبی اور فکری تحاریر کا جریدہ
ماہنامہ بک ڈائجسٹ
Book Digest
لاہور پاکستان
ISSN 2079-4584
مدیر اعلیٰ: منظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل
جازکیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جا سکتا ہے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

درِ نبیؐ سے مگر رابطہ ضروری ہے

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

محمدٍ و علی آل محمدٍ کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید۔ اللھم بارك علی محمد و علی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید۔

آقائے دوجہاں، صاحبِ کون ومکاں، نیّرِ تاباں، صاحبِ قرآں، پیغمبرِ آخرالزماں، تفسیرِ فرقاں، حبیبِ ربِ کریم،

صاحبِ خلقِ عظیم، سید ابرار، احمدِ مختار، سرکارِ دوعالم، سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، ، امام الانبیاء منبع جود وسخا، سیدِ عرب وعجم، صاحبِ لطف وکرم، شفیع المذنبین، سید المرسلین، خاتم النبیین، صاحبِ کتابِ مبین، حضرت محمد مصطفیٰ، احمدِ مجتبیٰ ﷺ کی شانِ نبوت اور رفعتِ مراتب کے حوالے سے قرآنِ مجید، فرقانِ حمید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ و یغفرلکم ذنوبکم ۔ واللہ غفور الرحیم۔ (سورۃ آلِ عمران آیت ۳۱)

ترجمہ: (اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے، اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ (یوں) اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں سے در گزر فرمائے گا۔ بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور انؐ کی ذاتِ مبارکہ اور اسوہ حسنہ سے عشق، بندہ مومن کی حیاتِ مستعار کا سب سے قیمتی سرمایہ اور سب سے عظیم متاع ہے۔

ایک اور ارشادِ باری تعالیٰ پر غور فرمائیے:

ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی۔ یا یھا الذین اٰمنو صلو علیہ و سلمو تسلیما۔

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی ﷺ پر۔ اے ایمان والو تم بھی آپ ﷺ پر درود وسلام بھیجا کرو۔

اس آیت مقدسہ میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر صلوۃ وسلام بھیجا کریں۔ مگر اس کی تعبیر و بیان میں یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے خود اپنا اور اپنے فرشتوں کا، رسول اللہ ﷺ پر صلوۃ بھیجنے کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد عام مومنین کو اس بات کا حکم دیا جس میں آپ ﷺ کے شرف وعظمت کو اتنا بلند فرما دیا کہ رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے کا جو حکم مسلمانوں کو دیا جاتا ہے وہ کام ایسا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی کرتے ہیں ۔تو عام مومنین جن پر رسول اللہ ﷺ کے بے شمار احسانات ہیں ان کو تو اس عمل کا بڑا اہتمام کرنا چاہیے اور ایک فائدہ اس تعبیر میں یہ بھی ہے کہ اس سے درود و سلام بھیجنے والے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ثابت ہوئی کہ اللہ رب العزت نے ان کو اُس کام میں شریک فرما لیا جو کام خود اللہ پاک اور اس کے فرشتے کرتے ہیں۔

لفظِ صلوۃ عربی زبان میں رحمت، دعا اور مدح وثنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف جو نسبت صلوۃ کی ہے، اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہے، فرشتوں سے صلوۃ، ان کا، آپ کے لیے دعا کرنا ہے اور عام مومنین کی طرف سے صلوٰۃ کا مفہوم، دعا اور حمد وثنا کا مجموعہ ہے۔ لہذا یہ واضح ہوا کہ نعت گوئی اور مدح سرائی ایک ایسا عمل ہے جو اللہ پاک اور اس کے ملائکہ کی سنت ہے۔ اور ایمان والوں کے لیے اس پر عمل کرنا باعث سعادت وبخشش ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ جس بلند و بالا شخصیت اور ممدوحِ ملائک ہستی کی تعریف، اللہ پاک خود فرماتا ہے اور قرآن حکیم کی متعدد بابرکت آیات اس کی وضاحت کرتی ہیں تو کسی انسان سے کہاں ممکن ہے کہ اس عظیم المرتبت ہستی کی مدحت، ان معنی اور اس سطح پر کر سکے، جس کا وہ حق رکھتے ہیں۔ تاہم اپنے رہبر و راہنما، مرشد و مربی، اور حبیبِ کبریا سے محبت، عقیدت اور عشق کا جذبہ تو ہر امتی کی سرشت میں شامل ہے۔ البتہ ہر ایک کی علمی و دینی فہم، ادراکی رسائی اور عشقِ رسول ﷺ میں وارفتگی اپنی اپنی ہے۔ جنابِ رسالت مآب کے مداحوں کی بات چھڑے تو اگرچہ حضرتِ اویس قرنی جیسے عظیم المرتبہ عاشقِ رسول ﷺ کا اسم مبارک دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر کاروانِ مدحت وعقیدتِ رسول ﷺ کے سرخیل کے روپ میں سنہری حروف سے لکھا جانے والا ہے کہ انھوں نے وہ مثال قائم کر دی جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ مگر حسان بن ثابت نے قلم قبیلے کے لیے ایک ایسی راہ کا انتخاب کر دیا۔ جس پر چلنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ قیامت تک جاری وساری رہے گا۔

جنابِ صاحبِ لولاک کی عقیدت نگاری، مدحت سرائی، اور ثناخوانی کے لئے ان کے منصبِ عالی اور مقامِ محمود کو مدِ نظر رکھتے ہوئے الفاظ و تراکیب کے چناؤ، ان کا دروبست اور معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ پیرائیہ اظہار کی پاکیزگی اور شائستگی کا عمدہ معیار قائم رکھنا پڑتا ہے، جس کے لیے احکامات

الٰہیہ اور علم زباں و بیاں کی باریکیوں سے عہدہ برا ہونا از بس ضروری ہوتا ہے۔ اور الحمدللہ جنابِ سہیل احمد صمیم کو ذاتِ باری تعالیٰ نے اس وصف سے مالا مال کر رکھا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کی اشاعت میں مدحتِ سرکار ﷺ کا چناؤ کیا اور اس کا اسلوب روایتی عقیدت نگاری سے ذرا مختلف رکھا ہے۔

''الی النور'' کے مطالعے سے اس کے جداگانہ اسلوب کی جو تفہیم ہوتی ہے، اس کے پیچھے جنابِ صمیم کا مستحکم علمی پس منظر اور تاریخ انسانی سے گہرے شغف کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں چند گذارشات رب کائنات کے حضور، یوں پیش کی گئی ہیں گویا صاحبِ تصنیف، تخلیق آدم کے فیصلے سے لیکر آج تک کی رودادِ آدمیت کا راوی ہے اور پھر بحیثیت انساں وہ اپنی منزل کا متلاشی ہے۔ یہاں پر ایک خاص نقطے کی تفہیم کا قضیہ آڑے آتا ہے۔ کیونکہ ہر قاری کسی شعری یا نثری فن پارے کو اپنے ذوقِ جمالیات اور استعدادِ فہم و فراست کے تناظر میں ہی دیکھ پرکھ سکتا ہے۔ جس میں تفہیمی آرا مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔ البتہ راقم السطور کو اس طویل حمدیہ نظم کو دو حوالوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔ ایک یہ کہ مصنف نسل انسانی کی ساری روداد کے پیچ و خم سے واقف ہوتے ہوئے اپنے رب کے سامنے دہراتا ہے۔ سارے حقائق بیان کرنے کے بعد بھی اپنے انجام سے نا واقف ہے اور اپنی منزل کا پتہ ابھی بھی اپنے ہادی سے پوچھتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ نسلِ انسانی کے ساتھ پیش آنے والے سب حقائق و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے منصب خلافت کے حقدار کی عاقبت نا اندیشی سے رونما ہونے والی صورتِ حال پر تاسف کا اظہار کرتا ہے اور ''**وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون**۔ کے تناظر میں دیکھتا ہے تو اقرار کرتا ہے کہ میں یعنی انساں اپنی منزل یعنی مقصد حیات سے بہت دور ہو چکا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں صاحب کتاب کے علمی مقام اور مہارتِ ترسیلِ جذبات کی داد دینی پرتی ہے۔

بات کی جائے مدحت سرائی کی تو جنابِ صمیم بیک وقت حالات و واقعاتِ زمانہ کا مبصر بھی نظر آتا ہے اور جنابِ رسالتِ مآب کا نقیب اور غلام بھی۔ اسے پختہ یقیں ہے کہ جس ہستیِ مکرم نے تیئس سالہ دورِ نبوت میں جزیرہ نمائے عرب سے شرک، کفر، بت پرستی، شراب نوشی، جوا بازی اور دیگر معاشرتی برائیوں کا قلع قمع کیا اور شمع توحید روشن کر کے ظلم و استبداد کی ماری انسانیت کو ایک نئی روشنی، نیا منشور، نئی فکر اور ایک نیا ضابطہِ حیات تفویض فرمایا وہ ہستی تا ابد رحمت اللعلمین ہوتے ہوئے ہر وقت اور ہر دور میں نوعِ انسانی کے لیے صحتِ احوال اور درستیِ حالات کی امین ہے۔ لہذا وہ اپنی متعدد نظموں میں آپ ﷺ کے حضور حالات حاضرہ اور احوال امہ کا نقشہ اس مہارت سے پیش کرتا ہے کہ الفاظ سے زیادہ جذبے کا عمل دخل دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کلام بالواسطہ کی بجائے کلام راست کا اسلوب اپناتا ہے اور انسانیت کو درپیش مسائل کا نوحہ ادب و احترام کے ساتھ حضور نبی کریم، رحمت اللعالمین ﷺ کے دربار میں پیش بھی کرتا ہے اور آپ ﷺ سے اصلاح احوالِ امت کا خواستگار بھی ہے۔ اس حوالے سے ''الی النور'' میں شامل نظم بعنوان ''حل'' دیکھی جا سکتی ہے۔

پھر ''الی النور'' سے گذرتے ہوئے قدم قدم پر رکنا پڑتا ہے۔ کہیں تو نقطہ دائرہ کا فلسفہ جاننے کیلئے اور کہیں اہلِ ایمان کی سوچ و فکر کے مختلف زاویوں کی حقیقت کو تفہیمی وادرا کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے۔ کہیں وجودِ آدم کے ارتقا کو رکتا دیکھتے ہوئے اور کہیں کائنات میں سکون کا ایک پل تلاش کرتے ہوئے۔ کہیں شعور و آگہی کے راستے میں جدیدیت کے اماموں کے بٹھائے ہوئے اژدھاؤں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اور کہیں تصوراتِ دین کے مرکزی بیانیے کی عالمی دباؤ میں آکر، بنا مصلحت خاموشی کا راز جاننے کے لیے۔

اور پھر اچانک ایک مختصر ترین جملہ ''چلو چلیں'' ان تمام عالمی و مقامی، علمی و دینی، معاشرتی و نفسیاتی اور سماجی و ثقافتی رکاوٹوں کو ایک ہی جست میں عبور کیے جاتا ہے۔

چلو چلیں!
دیارِ بدگمان سے یقین کی طرف
مکان سے مکین کی طرف
کسی مباحثِ حسین کی طرف
چلو چلیں!
سوال سے جواب کی طرف
سراب سے گلاب کی طرف
گناہ سے ثواب کی طرف
چلو چلیں!
فریبِ وقت سے شعور کی طرف
چلو چلیں حضور ﷺ کی طرف۔

اور پھر جنابِ صمیم جب دربار رسالت میں حاضر ہوتے ہیں تو یوں مدحت سرا ہوتے ہیں؛

عروض و بحر نہ حسن و ادا ضروری ہے
سخن ہو نعت کا تو پھر دعا ضروری ہے
جہاں میں چاہے، جہاں گزرے زندگی تیری
درِ نبیؐ سے مگر رابطہ ضروری ہے

پھر یہی ضروری رابطہ ان سے ''حضور ﷺ کا غلام ہوں'' جیسی شاہکار نعتیہ نظم بھی کہلوا اٹھتا ہے اور نسبتِ آقا ﷺ کے باوصف دیدار مدینہ کو حصولِ کل جہاں پر ترجیح دینے والا عاشقِ رسول ﷺ بھی بنا دیتا ہے۔

نعت کہنے کے لیے طرزِ بیاں مل جائے

بے زباں شخص کو یعنی کہ زباں مل جائے
دل میں دیدارِ مدنیہ کی طلب ہے مولا!
کب یہ کہتا ہوں مجھے سارا جہاں مل جائے

اور یہی رابطہ انہیں نقطۂ دائرہ اور وجہِ وجودِ کائنات کا ادراک بھی عطا کرتا ہے۔

ایک نقطے پہ جہاں سارا ہوا ہے قائم
بالیقیں سوچ یہ کہتی ہے، وہ نقطہ ہیں حضورؐ

اور فنِ نعت گوئی کی باریکیوں کا شعور اور جنابِ رسالت مآب ﷺ کے مقام و مرتبے کے حوالے سے فرامینِ خداوندی کی آگہی بھی:

چند قرآنی آیات اور ان کے تناظر میں صمیمی اشعار ملاحظہ کیجیے:

یا یھاالذین آمنو ! لا ترفعو اصواتکم فوق صوت النبی

(اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو)۔

عشق یوں ہو کہ ملے میری ثنا کو پرواز
اک ذرا اونچی نہ ہو میری کبھی بھی آواز

و رافعنا لك ذكرك۔

زمیں پہ دھوم آپؐ کی، فلک پہ دھوم آپؐ کی
ہر اک جہاں میں دلفریب تذکرے ہیں آپؐ کے
ازل سے لے کے تا ابد ہے تذکرہ حضورؐ کا
بلند سے بلند تر ہے مرتبہ حضورؐ کا

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجدالحرام الی المسجد الاقصیٰ۔

انؐ کی پرواز کی رفتار کا اندازہ کریں
چند لمحوں میں جو صدیوں کا سفر کرتے ہیں

یا یھاالذین آمنوا صلو علیہ و سلمو تسلیما۔

درود پڑھتے ہیں انؐ پر سلام بھیجتے ہیں
بس ایک کام یہی صبح و شام کرتے ہیں

جناب صمیم کے اس مجموعہ نعت میں نسبتِ رسولی کا ایک خاص حوالہ بھی موجود ہے کہ انھوں نے آقائے نامدار ﷺ کی بعثت کے بعد دس سالہ مکی زندگی کی نسبت سے دس ابیات، آپ کی تیرہ سالہ مدنی زندگی کی نسبت سے تیرہ قطعات، تئیس سالہ دور رسالت کی نسبت سے تئیس نظمیں، آپ ﷺ کی بعثت سے قبل چالیس سالہ حیاتِ مبارکہ کے حوالے سے چالیس مصرعوں پر مشتمل ایک نظم اور آپ ﷺ کی تریسٹھ سالہ حیاتِ مقدسہ کی نسبت سے تریسٹھ اشعار پر مشتمل ایک شاہکار نعتیہ مسدس شامل کر کے ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ بظاہر یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے مگر بادی النظر میں اس اہتمام کے پس منظر میں میں جناب صمیم کی آقائے دو جہاں سے والہانہ محبت اور نسبتِ کی اہمیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہتمام بھی دیکھیے کی پوری کتاب کے مندرجات میں کہیں بھی باوجود شعری و عروضی ضروریات کے پیشِ نظر رعایت میسر ہونے کے، آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے لیے الفاظ تخاطب میں 'تُو'، 'تم'، 'تمہارے'، 'تیرے' اور 'اس' جیسے الفاظ کے استعمال سے احتیاط برتتے ہوئے 'آپ'، 'اُن'، 'آپکے' اور 'انہی' جیسے مودبانہ الفاظ کے استعمال کا اہتمام کیا گیا ہے جو کہ جنابِ صمیم کی اعلیٰ علمی بصارت اور فنی مہارت کا ثبوت بھی ہے اور فنِ نعت گوئی کی رموز آشنائی کے ساتھ ساتھ جنابِ رسالت مآب ﷺ کے ادب، احترام اور توقیر کے حوالے سے احکاماتِ خداوندی کی پیروی بھی۔

ایک اور نعت شریف کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بس ایک چشمِ کرم، اے رسولِ عرب و عجم
مٹیں گے درد و الم، اے رسولِ عرب و عجم
ادا میں کر نہیں سکتا حقِ ثنا خوانی
اگر ہوں سات جنم، اے رسولِ عرب و عجم
کریں قبول مجھے بزمِ نعت گوئی میں
عطا ہو زورِ قلم، اے رسولِ عرب و عجم

اور پھر ان اشعار کو بھی دیکھیں:

اگرچہ میری رگوں میں رواں دواں ہے نعت
مگر حضورؐ کے معیار کی کہاں ہے نعت
بس ایک نسبتِ آقاؐ کا ہے سہارا ہمیں
ہم عاصیوں کے لیے ایک سائباں ہے نعت

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جنابِ سہیل احمد صمیم کا یہ نعتیہ مجموعہ چار مستحکم حوالوں کا حامل ہے۔ جن میں:

۱۔ مصنف کا علوم اسلامیہ سے گہرا شغف اور ہادیِ برحق سے والہانہ عشق و عقیدت ہے

۲۔ نعت کے روایتی انداز میں ارتقائی روش

۳۔ حالاتِ حاضرہ اور امتِ مسلمہ کی حالتِ زار کا نوحہ اور

۴۔ صاحب کتاب کا عمدہ اسلوبِ سخن اور پیرایۂ و قرینہِ اظہار ہے۔

اور یہ چاروں حوالے اس بات کے بھرپور اور جائز متقاضی ہی نہیں مستحق بھی ہیں کہ ہر ایک پر انفرادی طور پر قلم آزمائی کی جائے مگر آج کی اس مضمون کی نوعیت اور اشاعتی مقدار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اختصار سے کام لیا گیا ہے اور ایک ہی تحریر میں ''الی النور'' سے آشنائی کی کوشش کی گئی ہے۔ جنابِ صمیم کو ایک عمدہ نعتیہ مجموعے کی اشاعت پر دلی مبارک باد۔

شب نشین.....ایک مطالعہ

محمد نوید مرزا/ لاہور

جدید اردو نظم بتدریج ارتقاء پذیر ہے۔اس میں نت نئے موضوعات کی آمیزش اور رنگا رنگی نے اسے گردوپیش کے حالات وواقعات سے ہم آھنگ کر دیا ھے۔اردو نظم کی ابتداء دکن سے ہوئی تھی۔اس دور کی نظم میں زیادہ تر مذھبی خیالات کو پیش کیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ تصوف،قدرتی مناظر،حسن وعشق،سماجی موضوعات اور عوامی مسائل بھی نظم کا حصہ رہے ھیں۔ایک طویل عرصہ سفر کرنے کے بعد جب نظم نئے دور میں داخل ہوئی تو نظیر اکبر آبادی نے شاندار نظمیں لکھیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں سماجی اور عوامی موضوعات کو پیش کیا۔اس کے بعد مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کی نظمیں سامنے آئیں۔مولانا ظفر علی خان نے بھی نظمیں لکھیں۔ تاھم نظم کو جدید دور کے تقاضوں اور نئی لفظیات سے جوڑنے میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے بے پناہ تخلیقی قوت کا مظاھرہ کیا۔اقبال کی نظم کو ھر سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فیض احمد فیض،احمد فراز،ساحر لدھیانوی،احمد ندیم قاسمی اور کئی شعراء نے نظم کو عروج بخشا۔اس کے علاوہ ن م راشد،مجید امجد،میرا جی،مختار صدیقی،ڈاکٹر وزیر آغا،منیر نیازی،اختر حسین جعفری اور فہمیدہ ریاض نے بھی اعلی نظمیں تخلیق کیں۔بعد ازاں نظم کے عمدہ شاعروں کی ایک طویل فہرست ھے،جن میں بشیر رحمانی،ڈاکٹر وحید احمد،ڈاکٹر سعادت سعید،ڈاکٹر ابرار احمد،ڈاکٹر جاوید انور،فرخ یار،اعجاز رضوی، فرحت عباس شاہ اور افتخار بخاری کے علاوہ بہت سے نام شامل ھیں۔دیار غیر میں بھی بہت سے شاعر اردو ادب کا چراغ روشن کئے ھوئے ھیں۔انہی شاعروں میں ایک اھم نام ولی عالم شاھین کا بھی ھے،جنھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں بھر پور اور عمدہ شاعری کی ھے۔ان کی کتابیں زرداغ،پشتارہ،کھلا دروازہ،دھلیز پر پھول،رگ ساز،بے نشان اور زیر مطالعہ مجموعہ،شب نشین شاعر کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ھیں۔شب نشین کا پہلا ایڈیشن بھارت سے شائع ھوا تھا اور نیا ایڈیشن 20 اضافی نظموں کے ساتھ پاکستان سے نستعلیق مطبوعات نے شائع کیا ھے۔بقول ابوالکلام قاسمی،، ولی عالم شاھین ایک پختہ کار،حساس اور بیدار مغز شاعر ھیں۔ان کی نظموں اور غزلوں کے متعدد مجموعے شائع ھو چکے ھیں۔یوں تو شاھین غزل گوئی میں بھی امتیازی شان رکھتے ھیں مگر نظمیں ان کی افتاد طبع، وسعت فکر اور موضوعاتی تنوع کی زیادہ بہتر عکاسی کرتی ھیں۔ان کی نظموں میں عالمی سطح کی سیاسی اور سماجی صورت حال اور اس پس منظر میں انسانیت کو درپیش مسائل ومشکلات کا گہرا ادراک اور ان سے جذباتی سروکار ملتا ھے۔

قاسمی صاحب کی رائے کی روشنی میں جب ھم شاھین صاحب کی نظموں کا عمیق جائزہ لیتے ھیں تو ان میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ حقائق کی ترجمانی بھی نظر آتی ھے۔شب نشین میں شاعر نے پابند نظم،نظم معرا اور آزاد نظم میں اپنی شاعری قارئین کے سامنے پیش کی ھے۔ان کے پاس موضوعات کی فراوانی ھے۔انھیں ھر طرح کی نظم کہنے پر دسترس حاصل ھے۔وہ نظم کے عمومی ڈھانچے سے واقف ھیں اور ان کی ھر نظم کی سطر سطر میں خوبصورتی ھے۔کتاب کا انتساب عمدہ ھے،شاھین صاحب لکھتے ھیں،زندگی،معاشرہ اور تخلیق کار کے اس رشتے کے نام جس میں الٹے مثلث کے اوپر سے اترتی ھوئی زندگی اور معاشرے کی تاب وتوان نیچے تخلیق کار تک پہنچتی ھے۔

ع کہ خار خشک کو بھی دعویٰ چمن نسبی ھے (غالب)

یہی انتساب ھے،جو شاعر کے زندگی اور اس کے قرب وجوار سے جوڑتا ھے۔

شاھین صاحب ایک حساس اور باخبر شاعر ھیں۔اس کتاب میں وہ ایک کامیاب اور جدید نظم گو کے طور پر ھمارے سامنے آئے ھیں۔ان نظموں کے موضوعات بھی منفرد ھیں،چند نام ملاحظہ کریں،تلوے کی مردہ کھال،فیس بک،دھوپ کا رنگ،گیلا کاغذ،گوشت کا ایک لوتھڑا دل،حکم نامہ،مفروضوں پر چلتی دنیا،درد شب نشیناں،اٹھائی گیرے،لامساوی، ابا سب اک کھیل،چڑیلیں،وبائیہ،خدمتانہ اور کیٹ واک کے بعد شامل ھیں۔نظموں کے منفرد عنوانات کے ساتھ یہ نظمیں بھی اپنے اندر بھر پور توانائی اور انفرادیت رکھتی ھیں۔

شب نشین کی ساری نظمیں شاعر کی طویل ریاضت اور شاعری سے بھر پور لگاؤ کی ترجمانی کرتی ھیں۔شب نشین جدید دور کے تقاضوں سے ھم آھنگ ایک خوبصورت مجموعہ ھے،جو نظم نگاری کے حوالے سے شاعر کی بہترین کاوش ھے۔یوں شب نشین کو پچھلے چند برسوں میں شائع ھونے والے چند اچھے مجموعوں میں شمار کیا جا سکتا ھے۔آخر میں شاعر کی ایک نظم،معدوم پیش خدمت ھے۔۔۔۔

میں ھی ناکارہ ھوں یا گرمئی بازار ھے کم
کیوں دگرگوں ھوا اتنا دل وجاں کا عالم
(وقت رکھتا ھی نہیں عمر گریزاں کا بھرم)
جسم کمزور ھے اور لذت حس سے محروم
خوف آئندہ ھے یا پھر کوئی فکر موھوم
شے جو مقسوم تھی وہ بھی ھوئی یکسر معدوم
مگر اب بے سروسامان نہیں ھوتا ھوں
دور و نزدیک سے انجان نہیں ھوتا ھوں
اپنے سائے سے پریشان نہیں ھوتا ھوں

ندرتِ خیال ...... ایک مطالعہ

ڈاکٹر عادل سعید قریشی/ایبٹ آباد

ڈاکٹر خالد ندیم میرے محبی اور دوست خاص ہونے کے علاوہ پی ایچ ڈی کے بیرونی ممتحن بھی رہے ہیں بالفاظ دیگر میرے استادِ نصف، جن کا مجموعہ مقالات بنام 'ندرت خیال' منصۂ شہود پر آیا۔ اشاعتی ادارہ 'نشریات'، صفحات ۱۷۶، سن ۲۰۲۳ء، پیش گفتار کے بعد شاہین عباس کی تقدیم شامل ہے۔ فہرست میں آٹھ باب اور یہ ادب کے کسی بھی طالب علم کے لیے بالکل نئے اور نادر ہیں۔ اب جب کتاب کھول لی اور دیکھ لیا کہ فہرست ایسی نادر ہے کہ ان موضوعات پر کبھی سوچا نہ تھا ہاں تھوڑا بہت پڑھا ضرور تھا تو تجسس اور آمادگی کا گراف ایک دم بڑھ گیا اور پہلا باب 'مکتوباتی ناول' کو پڑھنا شروع کر دیا اور صاحب تصنیف کے تبحر علمی، ندرت فکر و خیال کے ساتھ ساتھ اسلوب کی تازگی اور شائستگی نے دل کو گرفت میں لے لیا۔ پہلے یہ جان لیجیے کہ ڈاکٹر خالد ندیم ایک خوش فکر انشاپرداز، معتدل ناقد اور بالغ محقق ہیں، یہ تینوں خوبیاں تو قریباً ہر تیسرے اہل قلم کے ہاں مل جائیں کہ لیکن جو دو خوبیاں ڈاکٹر موصوف کو اپنے معاصرین سے جدا کرتی ہیں، ان میں ایک ان کے موضوعات کا انفراد ہے اور ثانیاً ان کا اسلوب ہے۔ میں یہاں انہی دو پہلو کو اپنا موضوع بناؤں گا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہو گا کہ ان کے سوا خوبیاں ان کے ہاں موجود نہیں۔ میرے اس دعوے کو ان کی تصانیف تقویت دیں کہ جن میں میر سے فیض تک، اختر حسین رائے پوری: حیات و خدمات ۔ جہانِ تلمیحات۔ شبلی شکنی کی روایت۔ عہد حاضر کا فکری بحران اور اقبال۔ اردو میں ارمغان علمی کی روایت۔ شبلی کی آپ بیتی۔ آپ بیتی علامہ اقبال۔ آپ بیتی مرزا غالب، ایسے ہوتے ہیں نامے، حضور بحیثیت سپہ سالار، اردو ترجمہ مکاتیبِ شبلی، جمال میاں، اردو ترجمہ مکاتیبِ اقبال، انتخاب ولی دکنی، جھوٹا سب سنسار۔ مکاتیب ڈاکٹر ابن فرید، رُقعاتِ مشفق خواجہ، اقبالیاتی مکاتیب، ارمغانِ رفیع الدین ہاشمی، نگارشاتِ مظفر حسین شمیم، کلیاتِ نثرِ اقبال، مطالعاتِ اسرار و رموز۔ لفظیاتِ اقبال، شامل ہیں جن میں موخرالذکر دو زیرطبع ہیں۔ یہ تمام کتب اپنے مصنف کی تازہ فکری، خوش خیالی، فطانت اور وسعت مطالعہ پر دال ہیں۔ ان کتب سے یہ اندازہ بھی سہولت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر خالد ندیم کی تخصیص کسی ایک شعبے سے ہرگز نہیں، جس طرح ان کا مطالعہ وسیع و وقیع ہے اسی طرح ان کے تحقیقی اور تنقیدی موضوعات متنوع ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم کی تازہ تخلیق ''ندرت خیال'' اپنی موضوعاتی ندرتا کے سبب اپنے قاری کو فکر و حظ کے الگ زاویوں سے آشنا کرتی ہے، جیسا کہ اس کتاب کے ابواب کی تعداد آٹھ ہے جس میں پہلے دو باب، مکتوباتی فکشن کے حوالے سے ہیں۔ پھر فرضی مکتوبات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہے اور اس کے بعد چوتھا باب منظوم مکتوبات یا رقعات پر مشتمل ہے۔ پانچواں باب منظوم پہیلیوں کے لیے مختص ہوا ہے اور چھٹے باب میں صنعت تلمیح اور اس کے حوالے سے مثالوں کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ خردہ گیری، ساتویں باب میں اور آٹھویں باب میں علمی خطبات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ سارے موضوعات اردو کے قاری کے لیے نئے یا نادر نہیں لیکن ندرتا کا پہلو یہ ہے کہ ان سارے منفرد عنوانات کو پہلی بار ایک الگ انداز سے مذکور کیا گیا ہے جہاں درحقیقت آج کے اسکالرز کی فہم و ضرورت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ممکن یہ میرے اس جملے سے یہ تاثر پیدا ہو کہ یہ مقالات طلبہ کے لیے لکھے گئے ہیں اور ان کا معیار بھی طالب علموں والا ہے، تو یہاں مجھے یہ اعتراف کرنے دیجیے کہ میں نے یہ کلمہ حق اس لیے کہا ہے کہ اسکالر طلبا کے لکھے جانے کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ لکھنے والے نے دقیق اور ادق اصطلاحات اور مباحث سے کلیتاً احتراز برتا ہے اور سلیس و سادہ زبان میں ان موضوعات کو برتا ہے۔ رہی بات غیر اسکالرز کے حوالے سے اس کتاب کی افادیت اور ضرورت کی تو میں یہ بات بھی اعتماد سے کہہ رہا ہوں کہ میرے لیے بھی اس کتاب میں ہر عنوان نیا اور تازہ تھا گو میں بہت سے موضوعات سے آگاہ تھا لیکن فرضی مکتوبات، منظوم پہیلیاں، صنعت تلمیح اور خردہ گیری سے میرا حقیق تعارف اسی کتاب کا مرعون منت ہے اور یہ بھی کہ جس انداز میں ڈاکٹر خالد ندیم نے موضوعات کو چنا اور برتا وہ واقعی ایک حقیقی محقق اور معتبر ناقد کا کام ہے۔ اس ساری کتاب کا بالاستعیاب مطالعہ تین حقیقتوں کو مترشح کرتا ہے، اول مصنف کی فکری منہج کی سنجیدگی، زبان و بیان کی خوش سلیقگی اور لکھاری کا وسیع مطالعہ، ان تینوں کو اگر ایک جملے میں بیان کروں تو کہوں گا کہ اس کتاب کی ندرتا اس کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا اسلوب بھی ہے۔ یہی دونوں یعنی موضوعات اور اسلوب آج میرا موضوع ہیں۔

فکشن کے حوالے سے یہ بات مجموعی طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ یہ تخلیقی ادب میں سب سے ثروت مند شعبہ ہے۔ اہل فن نے یہاں خوب تجربات کیے اور اصناف نثر میں اصنافی پابندی میں چھوٹ کے سبب

تخلیق کار کو اپنے تجربے کو موضوع سے معروض کرنے میں خاصی سہولت اور آسانی بھی میسر رہی ہے۔ یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ تخلیق کار اپنے ادب پارے کی ترسیل اور فکری ارفعیت کے لیے کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا لہذا وہ اصناف کی قیود کے اندر رہ کر انتقال معنی کی غرض سے کئی تجربات کرتا ہے انہی تجربات میں سے ایک تجربہ مکتوبات کے انداز کا ہے جو بہ یک وقت ناول افسانے، نظم میں کیا گیا اور اس کے قارئین کو یہ انداز پسند بھی آیا ہے۔ یہ انداز مکتوباتی کہلاتا ہے، جس میں ناول، افسانے اور نظمیں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے مکتوباتی ناول کے حوالے سے اپنی تحقیقی سرگرمی کا آغاز کیا اور پہلے انگریزی زبان میں لکھے گئے ناولوں کا مختصر تعارف مختصراً پیش کیا اور پھر اپنے اصل موضوع کی طرف بڑھے۔ وہ اردو کا پہلا مکتوباتی ناول 'جویائے حق' از ڈپٹی نذیر احمد کو قرار دیتے ہیں، پھر عبدالحلیم شرر کے ناول 'فردوس بریں' میں بھی خط نویسی کی ٹیکنیک ملتی ہے، قاضی عبدالغفار 'لیلیٰ کے خطوط'، مجنوں گورکھپوری کا 'سراب'، ایم اسلم کے تین ناول آشوبِ زمانہ، اشکِ ندامت اور بیتی باتیں، خط کے انداز میں لکھے گئے ناول ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول 'ڈاکیا اور جولاہا' بھی مکتوباتی ناول ہے۔

دوسرے باب میں مکتوباتی افسانے مذکور ہوئے ہیں، خط کے انداز میں راشد الخیری کا افسانہ 'بڑی بہن' کے نام' مخزن لاہور میں چھپا۔ راشد الخیری کے مکتوباتی افسانوں کا پورا مجموعہ ہے جس کا نام 'مسلی ہوئی پتیاں' تھا۔ ڈاکٹر خالد ندیم پھر اس مجموعے کا موضوعاتی تعارف کراتے ہیں۔ خاصی تفصیل سے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جن کو افسانہ نگار نے اپنا موضوع بنایا جن میں سماجی اور معاشرتی پہلو اہم ہیں۔ مکتوباتی افسانے کے حوالے سے دوسرا بڑا نام وہ سجاد حیدر یلدرم کا بتاتے ہیں۔ منٹو کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے، 'چغد' کا پہلا افسانہ 'ایک خط' یہ افسانہ اسم با مسمیٰ ہے۔ یہاں ڈاکٹر موصوف منٹو کے عمومی موضوع پر بھی بات کرتے ہیں اور پھر کرشن چندر اور انتظار حسین افسانوں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے کرشن چندر کا افسانہ 'ایک طوائف کا خط' اور اس کی مختصر کہانی بیان کی ہے۔ اسی طرح انتظار حسین کا خط 'ہندوستان سے ایک خط' جو افسانہ ہے منظر عام پر آیا ہے، تقسیم ہند کے نتیجے میں سامنے آنے والے ادب میں، یہ افسانہ خاصے کی چیز ہے۔ علی باقر کا افسانہ ضدی بھی مذکور ہوا ہے۔

تیسرا باب میں ڈاکٹر خالد ندیم نے اردو نان فکشن کے حوالے سے ان خطوط کو موضوع بنایا جو خط لکھے تو گئے ہیں لیکن مکتوب الیہ کو بھیجے یا بھجوائے نہیں جا سکے۔ جن میں سرفہرست مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط ہیں جن کو انھوں 'غبار خاطر' کے نام سے مدون کیا ہے۔ اس باب میں منثور خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ایم۔ اسلم کی کتاب 'خط کا جواب'، ابوالکلام کی کتاب 'غبار خاطر'، 'پردیسی کے خطوط'، ڈاکٹر محمد باقر کے 'لندنی دوست کے نام خطوط'، محمد یونس کی کتاب 'قیدی کے خط'، سعادت حسن منٹو کے 'اوپر نیچے اور درمیان' مجنوں گورکھپوری، اور کشور ناہید 'بری عورت کے خطوط' شامل ہیں۔ چوتھے باب میں منظوم مکتوبات کو مطالعے کے لیے چنا گیا ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو بر عظیم میں منظوم خط نویسی کا بانی قرار دیتے ہیں۔ اردو میں منظوم مکاتیب کی روایت موجود ہے، پہلا خط مغل شہزادی نے لکھا ہے، گارسیں دتاسی نے اٹھارہ نجی خطوط اپنی تالیف میں جمع کیے۔ اسی طرح حیدر آباد کے دو منصب داروں کے بیچ بھی خطوط ملتے ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین، مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، غالب، نواب آف لوہارو، ڈاکٹر سید حسن عباس، سید علی حیدر طباطبائی، اکبر الہ آبادی، شبلی، علامہ اقبال، حکیم احمد شجاع، قمر الہدیٰ فروسی، فیض احمد فیض، رضا نقوی واہی کے نام شامل ہیں۔

پانچواں باب ''منظوم پہیلی'' کے عنوان کے تحت باندھا گیا ہے۔ پہیلیوں کے بارے میں ہمارے ہاں عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ پاکستانی زبانوں کا موضوع ہے جیسے پنجابی یا ہندکو میں زبانوں میں ملتی ہیں یا چند پہیلیاں ہیں جو حضرت امیر خسرو نے کہیں ہیں۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے اس باب میں بھی پہیلی کے تعارف اور اس کی سماجی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ پہیلی کے حوالے سے خاصی سیر حاصل اور اساسی بحث کرنے کے بعد پہیلی گوئی کو مذکور کیا ہے۔ یہ اپنی نوع کا ایک منفرد مضمون ہے۔ امیر خسرو، مرزا محمد رفیع سودا، انشا اللہ خاں انشا، سعادت یار خاں رنگین، بہادر شاہ ظفر، حکیم مومن خاں مومن، منیر شکوہ آبادی، مولانا محمد حسین، تجمل خاں تجمل، صفی تبسم، شان الحق حقی کو بہ طور پہیلی گو شاعر شامل کیا اور مثالیں بھی دیں۔ چھٹا باب 'صنعت تلمیع' علم بدیع کی اس صنعت کے بارے میں خاصی تفصیل سے بات کی ہے اور مثالوں سے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔ اسی طرح ساتویں باب میں خردہ گیری مذکور ہے، بقول مصنف خردہ گیری سے مراد یہ ہے کہ کسی کتاب کے نقائص اور خامیوں کو سامنے لانا، اس حوالے سے ڈاکٹر خالد ندیم نے شبلی، محمد حسین آزاد، رشید حسن خان اور جمیل جالبی کی مثالیں بھی کیں اس باب میں خردہ گیری بحیثیت اصطلاح مذکور تھی ورنہ اس حوالے سے اردو میں کئی نام ور نقاد شامل کیے جا سکتے تھے۔ آٹھویں باب میں 'علمی خطبات' شامل ہیں۔ خطبات کی روایت اور اس کے حوالے سے مختصر ترین تاریخ مرتب کی گئی ہے۔

اب میں اپنے موضوع کے دوسرے پہلو کی

طرف گریز کرتا ہوں۔ اسلوب کی جو بھی تعریف آپ کے ذہن میں ہے، مجھے وہی منظور ہے، خود میں اسلوب کو کسی بھی تخلیق کار کا اولین حوالہ جانتا ہوں۔ کسی ایک زبان کے دو یا تین تخلیق کاروں کے مابین فرق جس لحاظ سے کیا جا سکتا ہے وہ اسلوب ہی ہے۔ اسلوب کے اجزائے ترکیبی کے حوالے سے حتمی بات نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ اسلوب کے اجزا کی نوع الگ الگ ہیں، ادبی، صنفی، نفسیاتی، علمی، انفرادی اور کلاسیکی وغیر کلاسیکی، انسان کی شخصی اثرات، ثقافتی اور معاشرتی اثرات بھی اسلوب کا حصہ بنتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کی کوئی بھی حتمی تعریف ممکن ہے نہ ہی اس کے ترکیبی اجزا کا تعین ممکن ہے، یہ طے ہے کہ اسلوب کسی بھی تخلیق کار کی شناخت اور کسی بھی تخلیق کار کی منتہا ہوتا ہے۔ صاحب اسلوب ہونا گونہ تفخر اور عز وشرف کے سوا ادبی قد کاٹھ کا ضامن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم کے اسلوب کا کلی جائزہ کے لیے تو ایک مقالہ بھی شاید کم ہو لیکن میں یہاں میں ان کے اسلوب کے چند ایک شناختی پہلوؤں کو مذکور کرتا ہوں تا کہ ان کے اسلوب کی تازگی اور شائستگی کا اندازہ کیا جا سکے۔ یاد رہے یہاں اسلوب کے بارے میں جو بات چیت ہوگی وہ بحوالہ 'ندرتِ خیال' ہوگی۔

'ندرت خیال' کا موضوعاتی تعارف تو کرایا جا چکا اب اس کے اسلوب کا عالم یہ ہے کہ یہاں موضوعات کے تنوع اور الگ الگ نوعیت کے باوجود ڈاکٹر خالد ندیم نے اپنی انشا میں روانی، سلاست اور شستگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ ساری کتاب میں ادق اصطلاحات، مشکل اور ثقیل تراکیب سے دامنِ نثر کو مامون رکھا ہے۔ ان کی یہ کتاب اپنی سادہ بیانی اور سلیس اردو کا عمدہ نمونہ ہے گو کہ موضوع خاصے ثقیل اور نادر تھے۔ اسلوب کے حوالے سے یہ بھی خاص بات ہے کہ ساری کتاب میں ڈاکٹر خالد ندیم کے وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے، ان کے پاس لفظیات اور معنیات کی خوش سلیقگی کا پتا چلتا ہے، چونکہ یہ سارے مضامین تحقیقی اور تنقیدی نوع کے ہیں، اس لیے اس کتاب 'ندرت خیال' میں ڈاکٹر خالد ندیم ایک بالغ محقق اور متوازن الفکر ناقد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے مفروضے ان کی محنت طلب طبیعت کا پتا دیتے ہیں، پھر ان کے مطالعے کی گھیرائی، بالیدہ فکر استادِ ادب کے ساتھ ساتھ وہ ایک معتبر انشا پرداز کے سامنے آتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی لائق لحاظ ہے کہ ڈاکٹر خالد ندیم نے اپنے مفروضوں کو دلائل سے ثابت کیا ہے اور نہایت معروضی انداز میں اپنے محاکے بھی دیے جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب کا ایک اور خاص زاویہ یہ بھی ملتا ہے کہ وہ اپنی بات کو نہایت اخلاص اور صراحت سے اپنے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر اپنے مبحث کو خاصی احتیاط اور وضاحت کے ساتھ نتیجے کی جانب بڑھاتے جاتے ہیں۔ کسی بھی کتاب یا کوئی استغاثہ تیار کرتے ہیں تو ان کا لہجے نرم اور ان کا انداز تیقن لیے دکھائی دیتا ہے۔ محاکے سے قبل وہ تمام پہلوؤں کو قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہاں مجھے یہ کہنا چاہیے کہ ڈاکٹر خالد ندیم ایک قاری دوست محقق و نقاد ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ ڈاکٹر خالد ندیم پہلے استاد ہیں بعد میں محقق و نقاد، کہ یہ سارے مقالات اور مضامین ان کے طلبہ و طالبات کے کام بھی آئیں گے، معلوم نہیں یہ خیال ان کو لکھتے سے تھا یا نہیں لیکن ان تحاریر کو پڑھ کر یہ خیال ضرور دل میں پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کے سامنے اپنے قارئین بھی تھے کہ جن کا مطالعہ اس نہج کا نہیں ہوگا کہ جس سطح کا وہ کام 'ندرت خیال' میں منظر عام پر لا رہے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں تمہید، اشارات اور مبادیاتی بیان تخصیصی انداز میں ملتا ہے جو ان کے تنقیدی شعور اور قاری کی ذہنی سطح کے ادراک کا پتا دیتا ہے۔ یہ چند خوبیاں ڈاکٹر خالد ندیم کے اسلوب کو ان کے معاصر انشا پردازوں، ناقدین و محققین سے جدا کرتا ہے، ساتھ ہی کتاب 'ندرت خیال' کو اردو ادب میں ایک بڑا اور اہم اضافہ قرار دیتی ہیں۔

شاہ حسن/ پشاور

اُس کا چہرہ تھکا تھکا سا ہے
سارا عالم خفا خفا سا ہے

بات کرتے ہو کیوں زمانے کی
دل تو تم سے جلا جلا سا ہے

اُس کی یادیں ہوائیں لائی ہیں
باغ دل کا کھلا کھلا سا ہے

جب سے دیکھا ہے اُس کی آنکھوں کو
بن پیے ہی نشہ نشہ سا ہے

زخم بھر جائیں گے میرے کیسے
یار میرا خفا خفا سا ہے

❁

دل نہ یوں گل کی آرزو کرتے
ہم نہ دامن لہو لہو کرتے

رازِ خالق نہ پا سکا واعظ
عمر گزری وضو وضو کرتے

دردِ دل سے نہ آشنا ہوتے
گر نہ بلبل سے گفتگو کرتے

تم کو جلوے کی تاب ہوتی اگر
یار ہم کو بھی روبرو کرتے

گر نہ خود کو وہ بے وفا کہتے
ہم تو اُس کو ہی سرخرو کرتے

دل کی دنیا میں گر نہ آتے ہو
ہم نہ خوابوں کی جستجو کرتے

حمدِ خالص کا شاعر

شاعر علی شاعر/کراچی

کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد میں مصروف ومگن رہتے ہیں، ایسے لوگوں میں ذاکرین، ساجدین، سالکین، مجاہدین، عالمین، کاملین، عابدین، زاہدین، مؤمنین، مسلمین کے ساتھ ساتھ صوفیاء اولیائے کرام اور مشائخ عظام کا شمار ہوتا ہے، مگر میری نظر میں اُن حمد گو شعرائے کرام کا شمار بھی مذکورہ بالا افراد میں ہوتا ہے کیوں کہ حمد گو شاعر بھی ہر وقت خدا کو ذہن میں رکھتا ہے، اُس کی قدرتِ کاملہ کے بارے میں سوچتا رہتا ہے، اُس کی خلاقیت سے متعلق سوچ بچار کرتا رہتا ہے۔ اِسی سبب وہ حمد گو شاعر گلزارِ وحدت میں رنگ رنگ کے گل ہائے حمد وثنا کھلاتا رہتا ہے جن کی نکہت سے گلشنِ حمد کی مہک سے کائنات کے خیابانوں کے ساتھ ساتھ بیابان ودشت و صحرا اور کوہسار ووادی ودمن بھی معطر نظر آرہے ہیں اور ان حمدیہ اشعار کی بھینی بھینی خوش بو سے مسلمانانِ عالمِ اسلام کے اذہان جلا پا رہے ہیں، قلوب روشن ہو رہے ہیں اور دماغ عطر بیز محسوس ہو رہے ہیں۔

ایسے ہی حمد گو شعرا میں عہدِ حاضر کا ایک اہم اور معتبر نام حسن عباسی کا ہے جن کے اب دو حمدیہ مجموعے ''سائیں'' (۲۰۱۵ء) اور ''صاحب'' (۲۰۱۸ء) نہ صرف زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں بل کہ قارئینِ شعر وسخن، ناقدینِ فنِ شاعری اور مشاہیرِ اُردو ادب کے ساتھ ساتھ طالبانِ علم وادب سے داد وتحسین بھی وصول کر چکے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے اُن معروف اشاعتی ادارے ''نستعلیق مطبوعات'' لاہور سے عمدہ کاغذ اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

حسن عباسی کے پہلے حمدیہ مجموعے ''سائیں'' میں شامل کلام پر پاکستان کے معروف شاعر وادیب اور طنز ومزاح نگار جناب عطاء الحق قاسمی نے اِن الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''حسن نے میرے اور آپ کے رب کو جس نظریے سے دیکھا ہے اور اِس حوالے سے جو شاعری کی ہے وہ حمدیہ روایت سے مکمل طور پر ہٹ کر ہے۔ حسن کا خدا بھی اُس کے محبوب کی طرح روحانی اور رومانی تجربے سے گزرا ہے۔ یہ ایک عجیب نظم ہے اور مجھے یقین ہے اِن کو یہ نظم دونوں جہانوں میں زندہ رکھے گی۔

حسن کے حمدیہ مجموعے ''سائیں'' کا نام بھی اپنے اندر گہری وسعت رکھتا ہے جو کہ انسان اور خدا کے اُلجھے ہوئے ازلی تعلق کو مزید اُلجھاتا نہیں ہے۔ حمد میں حسن عباسی کا جس خدا سے مکالمہ ہے وہ ''سائیں'' کی ردیف میں مزید وسعت اور گہرائی اختیار کر گیا ہے۔ اللہ کے ۹۹ ناموں میں جو صفات بیان کی گئی ہیں حسن عباسی کی ہر حمد کے ننانوے شعر اُن صفات سے بھی گہرا ربط رکھتے ہیں۔ ہر حمد کے ابتدائی اشعار میں روایتی حمدیہ شاعری کی طرح خدا کی توصیف وثنا ہے۔ حسن عباسی نے اپنی حمد میں مختلف استعاروں، تشبیہات، تلازموں اور تلمیحات کے خوب صورت استعمال سے جہاں شعریت کے حُسن میں اضافہ کیا ہے، وہاں انسان کے جذبات واحساسات کی بڑی بھرپور انداز میں نمائندگی بھی کی ہے۔

دراصل حسن عباسی کا حمدیہ مجموعہ ''سائیں'' ایک مسلسل حمد پر مشتمل ہے جس کی ردیف تو سائیں ہے، مگر قوافی تبدیل ہوئے ہیں۔ اِس مسلسل حمد کا پہلا قافیہ ''گزاریاں''، دوسرا کمائیاں''، تیسرا ''جلوے''، چوتھا ''دیکھی'' اور پانچواں ''کوٹھا'' ہے۔ اِس پوری حمد میں حسن عباسی نے صرف دو بحریں استعمال کی ہیں جن کے ارکان مندرجہ ذیل ہیں:

فاعلاتن مفاعلن فعلن

اپنی منت گزاریاں سائیں
تیری سب ڈیرہ داریاں سائیں

☆

جس کی تجھ تک رسائیاں سائیں
ہیں اُسی کی کمائیاں سائیں

☆

اور

فعلن فعلن فعلن فعلن

دیکھ کے تیرے جلوے سائیں
میں واری، میں صدقے سائیں

☆

تیری جھلک کیا دیکھی سائیں
اپنی ہو گئی چھٹی سائیں

☆

میری مرضی کوئی نہیں ہے
میں ہوں تیرا چیلا سائیں

اس فنی مہارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسن عباسی کو عروض کا علم بھی ہے اور ایک ہی تھیم کو بہت دُور تک لے جانا اُن کی عادت میں شامل ہے، اس سفر میں وہ تھکتے ہیں اور نہ اُن کو مسافت کی تھکن سے چُور ہونا پڑتا ہے کیوں یہ سفر جتنا آگے بڑھتا ہے اپنے مسافر کو روحانی طاقت سے ہم کنار کرتا ہے۔

حسن عباسی کی مسلسل حمد کا ہر ہر شعر پُر مغز اور گہری معنویت کا حامل ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو شخص اللہ تبارک وتعالیٰ سے سچی محبت کرتا ہے اور اُس کی جناب میں سرِ تسلیم خم کرتا ہے اُس میں یہ خوبی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ رب العزت کے بندوں سے پیار کرنے لگتا ہے۔ اُسے خود آگاہی بھی ہو جاتی ہے اور اللہ عزوجل کا عرفان بھی حاصل ہو جاتا ہے، کیوں کہ خود آگاہی سے ہی خدا آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یوں بندہ خدا کی مخلوق کو بھی پہچاننے لگتا ہے اور خالق کو بھی اچھی طرح جاننا شروع کر دیتا ہے۔ اُس

میں تسلیم و رضا کی آرزو زور پکڑ لیتی ہے اور میری نظر میں تسلیم و رضا کی آرزو بہت بڑی نیکی ہے جسے شاعرِ موصوف بار بار اپنی حمد میں طلب کر رہا ہے، کیوں کہ اُسے معلوم ہے کہ جس میں تسلیم و رضا جذب ہو جاتی ہے وہ خدائے وحدہٗ لا شریک کا پیارا بندہ بن جاتا ہے۔ حمد کا تعلق اسلامی شعار سے ہے اور شریعت و طریقت میں تسلیم و بندگی کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ شاعرِ موصوف نے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صبر و قناعت سے زندگی گزارنے کی دعا مانگی ہے، حقیقی بندگی کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

حسن عباسی کی حمدوں کا انداز بڑا سادہ اور اظہار سہلِ ممتنع میں ہے، لیکن یہ حمد معنوی و فکری اعتبار سے بڑی مؤثر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ سائیں تیرے جس قدر اوصافِ حمیدہ ہیں وہ تجھی کو زیب دیتے ہیں، جس قدر تیری صفاتِ کاملہ ہیں اُن سب کا سزاوار تُو ہی ہے۔ اے میرے اللہ سائیں مجھے ہمیشہ سچ بولنے کی توفیق دے اور اس پر استقامت نصیب فرما تاکہ میں ہر سچ و حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکوں اور مجھے کسی ظالم بادشاہ اور جابر شخص کا خوف نہ ہو، میں اپنی صداقت کے اظہار میں صاف و شفاف آئینے کی طرح بن جاؤں جو جیسا ہے اُس کا چہرہ اُسے ویسا ہی دِکھاؤں اور ساری دنیا کو دِکھا دوں کہ دنیا کا سب سے بڑا سچ تو ربِ عالم کی یکتائی کا اظہار ہے، اُس کے قادرِ مطلق ہونے کا اقرار ہے، اُس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کا انکار ہے۔ اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور کوئی اُس کا ہم سر نہیں۔

حسن عباسی، معبودِ عالم سے اِلتجا کرتے دِکھائی دے رہے ہیں کہ سائیں مجھے توفیق دے کہ میں جب بھی تیرے بارے میں غور و فکر کروں تو ہر طرف مجھے تُو ہی تُو نظر آئے۔ پھر مجھے کسی اور کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہ ہو، پھر مجھے کسی اور کی ضرورت ہی نہ رہے۔ تُو میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور تیرا یہ قرب مجھے حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کی طرف شاعر کی توجہ مبذول ہوتی ہے کیوں کہ صوفیائے کرام کے نزدیک اللہ سبحانہٗ کی ذات کا جلوہ تمام مظاہرِ عالم میں دِکھائی دیتا ہے اور وہ اپنی ہی صفات اور صنّاعی سے پہچانا اور اپنی ہی قدرت سے جانا جاتا ہے۔ یہ ساری حمدیں حسن عباسی کا انتہائی عمدہ اظہار ہے اور یہ ہی خالص حمد ہے۔

''سائیں'' کے حمدیہ اشعار پر پاکستان کے معروف حمد و نعت گو شاعر اور محقق ڈاکٹر خورشید رضوی کی رائے پیشِ خدمت ہے، ملاحظہ ہو:

''کائنات کا سب سے نمایاں تخلیقی رشتہ خدا اور انسان کا رشتہ ہے، مگر عجیب بات ہے کہ انسان کے تخلیقی اظہار میں اِس رشتے کی نمود کم کم رہی ہے۔ ہماری شاعری میں حمد گوئی کا تناسب دیگر اصناف کے مقابلے میں بہت قلیل رہا ہے اور جتنا ہے اُس کا بھی ایک بڑا حصہ بنے بنائے مضامین اور ڈھلے ڈھلائے اسالیب سے عبارت ہے جن میں بالعموم ذاتی واردات کی آنچ مفقود نظر آتی ہے۔

ایسے میں حسن عباسی کا حمدیہ دیوان ''سائیں'' ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کرتا ہے اور ایک ایسے آئینہ خانے میں لے جاتا ہے جہاں شاعر کا وفورِ احساس قاری میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ اِن نو بہ نو رنگوں میں کہیں بے مائیگی کا احساس ہے، کہیں نارسائی کی کسک، کہیں عجزِ ادراک کی جھلک اور کہیں شرفِ انسان کا وہ طنطنہ جس میں چھوٹے منہ سے بڑی بات بھی نازیبا معلوم نہیں ہوتی، گستاخی و بے باکی میں محبت کی زمزیں جھلکنے لگتی ہیں اور حُسنِ ادا سے شکوہ، شکر میں ڈھل جاتا ہے۔ حسن عباسی نے کارخانۂ عناصر کے ازلی تحیّر کو جو صوفیوں کے ہاں بار بار نمود کرتا ہے ''انارکی''، ''سرکس'' اور ''میجک شو'' جیسی اصطلاحوں کے استعمال سے معاصرت کا لمس عطا کر دیا ہے اور یوں پرانی شراب نئے ظروف میں آ کر نئی سرشاری عطا کرنے لگی ہے۔''

حسن عباسی کی طویل حمدیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات نے انسان کو جو شعور و فکر اور عقل و خرد کی دولت عطا کی ہے اور اُسے جو علم و دانش اور فہم و فراست بخشی ہے اُسی سے انسان نے اپنے اظہار اور سخن میں فکر و عمل کی روح پھونک کر اُسے متحرک اور زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ تراکیب اور تدابیر کی روشنی میں وہ کسی دوسری مخلوق کا محتاج نہیں، وہ اشرف المخلوقات ہے، یہ انسان پر اللہ رب العزت کی کتنی بڑی عنایت ہے، یہ عنایت دراصل شرفِ بشریت کا اعلان ہے کہ وہ عاجز ہوتے ہوئے بھی اختیارات کا حامل ہے۔ اِن تمام رموز و اسرار کو حسن عباسی نے اپنے فنِ شعر کے ذریعے حمدوں میں سمو دیا ہے اور اِن حمدِ مسلسل کے ہر شعر سے اُن کی فنی مہارت کا احساس ہوتا ہے، اُن کی حمدوں کے اشعار میں فکر انگیزی اور معنی آفرینی موجود ہے، اُن کے اشعار پڑھ کر انسان کی تخلیقی فکر اور خیال کی ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی فکر جس میں تخلیقیت کا شعور اُجاگر ہو جائے سب سے اعلیٰ فکر کہلاتی ہے اور جن اشعار میں یہ اعلیٰ فکر سمو جائے وہ آفاقی کلام کہلانے کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ حسن عباسی کے مذکورہ حمدیہ کلام میں یہی اعلیٰ فکر موجود ہے جس سے اُن کا حمدیہ کلام ادبِ عالیہ میں شمار ہونے کے لائق بن گیا ہے۔

اللہ وحدہٗ لاشریک نے انسان کو خیر و شر کی تخلیق کے ساتھ جو شعور و ادراک کی آنکھ عطا کی ہے حسن عباسی نے اُسی آنکھ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ اور اوصافِ حمیدہ کا عمیق مشاہدہ کیا ہے اور اُنھوں نے اِنھیں عمیق مشاہدات کو حمدیہ اشعار میں ہنر مندی سے پیش کر دیا ہے۔ اُن کے یہ دونوں طویل اور مسلسل حمدیہ کلام تقدیسی ادب میں نہایت اہم اور منفرد نوعیت کے حامل ہیں، جن کو پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے، میں اِس انفرادی اجتہادِ سخن پر اُن کی عظمتِ شاعرانہ کو سلام پیش کرتا ہوں۔

طاہر عدیل/کوپن ہیگن ڈنمارک

ہم میں یار ہماری اور تمہاری کیا ہے
ایسا ہے تو پھر یاری بھی یاری کیا ہے
جن کی زیست پہ رشک کیا کرتی ہے دنیا
وہ بھی سوچتے ہوں گے ہم نے گزاری کیا ہے
تم کہتے ہو مجھ کو چھوڑ کے خوش رہتے ہو
ایسا ہے تو لہجے میں بے زاری کیا ہے
سب کے زہد کا پردہ ہم نے اترتے دیکھا
اس نے بھی شانے سے شال اتاری کیا ہے
جب دیکھو کشکول اٹھائے پھرتا ہے وہ
اپنے ملک کا حاکم ہے یا بھکاری کیا ہے
کون سمجھ پائے گا میری آسانی کو
کون سمجھ پائے گا مری دشواری کیا ہے
میرے آگے پھول بھی رکھا ہے پتھر بھی
یہ اب مجھ پر ہے دونوں میں بھاری کیا ہے

پاس بیٹھا تھا مگر حال سنایا نہ گیا
راز دل،دل کے مکیں کو ہی بتایا نہ گیا
دل کئی بار لگایا تھا بچھڑ کر اس سے
ہاں مگر دل سے کہیں دل یہ لگایا نہ گیا
وزن اس پر تھا محبت کے کئی ناموں کا
سو لکڑ ہارے سے وہ پیڑ گرایا نہ گیا
ساری دنیا کو بھلا بیٹھے تھے جس کی خاطر
ہم سے وہ شخص کسی طور بھلایا نہ گیا
لڑکھڑایا وہ کہیں بھی تو سنبھالا ہم نے
جب وہ نظروں سے گرا ہم سے اٹھایا نہ گیا
جب حقیقت میں یہ بیدار ہوا لوگوں میں
پھر شعور ان کا کسی طور سلایا نہ گیا
وہ حقیقت کو بھی افسانہ بنا لیں طاہر
ہم سے افسانہ بھی افسانہ بنایا نہ گیا

دل ناتواں دماغ کو گمراہ کر گیا
چاہت کے باوجود بھی میں چاہ کر گیا
تم کیسے میرے دوست ہو خاموش ہی رہے
دشمن بھی میرے شعر پہ تو واہ کر گیا
گرچہ مرے خلاف تھا لیکن وہ تھا تو سچ
اس کا بیان دل میں مرے راہ کر گیا
قاتل نگاہیں اس کی بھی غفلت پسند تھیں
کچھ میں بھی اپنی جان کی پرواہ کر گیا
جتنے تھے ناز نخرے وہ محبوب نے کئے
عاشق تو بے بسی میں فقط آہ کر گیا
اس کا علاج ہے نہ کوئی اس کی ہے شفا
میں درد سے مسیحا کو آگاہ کر گیا
ہر شخص بھیک مانگتا پھرتا ہے اب یہاں
طاہر وطن کا حال یہ اک شاہ کر گیا

حق کہنے سے خود کو تو ہٹایا نہیں جاتا
جو جھوٹ ہے سچ اس کو بنایا نہیں جاتا
ہم سے نہ کرو ترکِ تعلق کا تقاضا
جو جھوٹا ہے وعدہ وہ نبھایا نہیں جاتا
اس عشق میں کچھ لمس ضروری تو نہیں ہے
پر روح کو بھی ہاتھ لگایا نہیں جاتا
مرنے کو وہ مرنا تو سمجھتے ہی نہیں ہیں
کچھ اس لیے اب جان سے جایا نہیں جاتا
طاہر میں محبت میں نکما تو نہیں ہوں
کیوں مجھ سے کوئی شخص بچایا نہیں جاتا

سب کی مرادیں پوری ہوں اور اب نہ کوئی کنگال رہے
میری دعا ہے سالِ نو تو اُلفت کا ہی سال رہے
عشق کا ایک اصول ہے یہ بھی اس کو یاد سدا رکھنا
شکوہ اس میں چلتا نہیں ہے چاہے کوئی حال رہے
جانے کیسا تقاضا اُس کا جانے کیسی تمنا ہے
ختم تعلق بھی ہو جائے لیکن بات بحال رہے
تو نے محبت کی تضحیک روا رکھی، ہے میری دعا
تجھ کو محبت ہو جائے اور یونہی تو بے حال رہے
وقت برا گر آ جائے تو سہنا درختوں کی صورت
پتے ٹوٹ بھی جائیں لیکن جسم کے اوپر چھال رہے
لوگوں کا ایمان ہے پیسہ سو وہ اتنا سمجھتے ہیں
رشتے جاتے ہیں تو جائیں پاس اپنے پر مال رہے
بس میں ہو تو اس لمحے کو طاہر ساکن کر دوں میں
تیرا ہمیشہ میرے شانے پر ہی یونہی گال رہے

عجب مسئلہ تھا جو بس میں نہیں تھا
وہ میرا تھا اور دسترس میں نہیں تھا
مری جاں پرندے میں تھی قید طاہر
مگر وہ پرندہ قفس میں نہیں تھا

اکمل حنیف / لاہور

رات خود کو جگا کے بیٹھ گئے
سامنے، ہم خدا کے بیٹھ گئے

اپنے سائے سے جب ہوئی وحشت
ہم دیے کو بجھا کے بیٹھ گئے

اس سے پہلے کہ ہم بکھر جاتے
ٹیک خود سے لگا کے بیٹھ گئے

دل زمانے میں جب لگا نہ کہیں
ماں کے پہلو میں جا کے بیٹھ گئے

گھر کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے
صرف رشتے بچا کے بیٹھ گئے

بات میری نہ اُس نے مانی جب
دل میاں منہ بنا کے بیٹھ گئے

اُس نے روکا تھا بولنے سے ہمیں
اور ہم مسکرا کے بیٹھ گئے

اُس کے لہجے کی تلخیوں کے عوض
خون اپنا جلا کے بیٹھ گئے

محوِ حیرت ہوئے سبھی اکمل
وہ مرے پاس آ کے بیٹھ گئے

تیرے جیسے ترے کمال کے دکھ
اِس لیے رکھے ہیں سنبھال کے دکھ

جو بہاروں میں سوکھ جاتی ہے
میں سمجھتا ہوں ایسی ڈال کے دکھ

کر کے دیکھا حساب جیون کا
دکھ ہی دکھ ہیں بچے نکال کے دکھ

دس برس میں ہوا تھا پیار مجھے
تیس کا میں ہوں، بیس سال کے دکھ

کیا کروں دوسری محبت کا
ماضی جیسے ہیں میرے حال کے دکھ

آنکھ کے ساتھ دل بھی روتا ہے
سوچ کر حضرتِ بلال کے دکھ

اپنے بچوں سے بڑھ کے پالے ہیں
میں نے اکمل نبیؐ کی آل کے دکھ

خوشیوں کا چاند دل کے فلک سے اُتر گیا
جانا کسی کا آنکھ میں اشکوں کو بھر گیا

شامیں اداس ہیں مری، دن بھی اداس ہیں
موسم کسی کے ہجر کا دل میں ٹھہر گیا

رخصت کے وقت مجھ پہ کھلا زندگی کا راز
بے کار کس قدر مرا سارا سفر گیا

آئے ہیں زخم روح پہ خود کو سمیٹتے
گر کر تمھارے ہاتھ سے اتنا بکھر گیا

ہر بار تیری یاد نے بانہوں میں بھر لیا
آوارگی سے تھک کے کبھی گھر اگر گیا

میں نے اُسے کہا: ترا ہنسنا کمال ہے
اک دن وہ اپنی بات سے ہنس کر مکر گیا

میرے بغیر ایک بھی لمحہ محال تھا
میرے بغیر آپ کا جیون گزر گیا!

اکمل! دکھاؤں کس کو میں اپنی یہ بے بسی
اک دوست خامشی سے عجب موت مر گیا

اک بے وفا کی یاد کو دل سے نکال کر
بیٹھا ہوں اپنے جینے کے رستے نکال کر

میں نے ترے فراق کا جب بھی کیا شمار
صدیاں بنی ہیں، وصل کے لمحے نکال کر

اُس کو دکھائی دیں گے مری ذات میں کمال
اک بار دل سے بغض کو دیکھے نکال کر

زرخیز کر رہا ہوں میں بنجر زمینِ دل
پتھر ہوئی ان آنکھوں سے چشمے نکال کر

باندھے تھے اک مزار پہ منت کے واسطے
اُس شوخ کے پراندے سے دھاگے نکال کر

ماں باپ کی نشانی تھا کل تک جو ایک گھر
بچوں نے بیچ ڈالا ہے حصے نکال کر

شاخِ غزل پہ صورتِ اشعار درج ہیں
لایا ہوں ذہن سے جو پرندے نکال کر

اکمل حنیف! جب کہیں لگتا نہیں ہے دل
میں بیٹھ جاتا ہوں ترے تحفے نکال کر

بے سبب تو نہیں ہم اشک بہانے والے
یاد آتے ہیں بہت چھوڑ کے جانے والے

یوں ترے رزق میں تخفیف بھی ہو سکتی ہے
اپنے آنگن سے پرندوں کو اڑانے والے!

تُو بتا، لوگ بھلا کس کا اڑاتے ہیں مذاق
عیب کے ساتھ مری ذات بنانے والے!

بن کے رہ جاتے ہیں دنیا میں تماشا اکثر
اپنی مجبوریاں لوگوں کو بتانے والے!

بھول جاتا ہوں مسائل میں زمانے کے سبھی
اک غنیمت ہیں مرے دوست پرانے والے

یار باتوں پہ اگر دھیان نہیں دو گے تم
جاؤ پھر ہم بھی نہیں خواب سنانے والے

میں غلط تھا جو تمھیں یار سمجھنے لگا تھا
ورنہ سب رنگ تھے تم میں بھی زمانے والے

کر چکے باپ کی تدفین ملازم گھر کے
سوچتے رہ گئے پردیس سے آنے والے

آنے والوں کے لیے پیڑ اُگاتے جائیں
ہم ہیں پُرکھوں کی روایات نبھانے والے

آج میں ایسی بلندی پہ کھڑا ہوں، اکمل!
سر اٹھا کر مجھے تکتے ہیں گرانے والے

احمد فراز سے محمد آصف بھلی کی خصوصی گفتگو

(احمد فراز کا غیر مطبوعہ انٹرویو)

میری شاعری میرے ماحول کی عکاس ہے

جو شاعر اپنے فن کے ساتھ منافقت کرتے ہیں وہ عوام کی نظروں میں کبھی توقیر حاصل نہیں کر سکتے

مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے اُردو کے ساتھ ساتھ پشتو زبان میں شاعری کیوں نہ کی

زیادہ ادبی فیض مجھے کراچی میں قیام کے دوران نصیب ہوا

س: فراز صاحب! سب سے پہلے آپ ہمیں اپنی زندگی کے ابتدائی حالات، بچپن کی معصوم خواہشات اور والدین کا آپ کی تربیت میں جو کردار رہا ہے اس کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: میں کوہاٹ سے تعلق رکھتا ہوں۔ سید گھرانے میں

پیدا ہوا۔ ہمارا خاندان کوئی زیادہ امیر نہیں تھا۔ بلکہ لوئر مڈل کلاس سے میرا تعلق ہے۔ ابتدائی تعلیم بھی ایسے سکولوں سے پائی کہ جیسے آج بھی ہمارے بچے بغیر چھت اور بغیر چٹائی کے زمین پر بیٹھ کر سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ میرے والد پشاور میں ملازم تھے۔ دسویں جماعت میں نے پشاور میں پاس کی۔ جب کالج میں ایف اے تک پہنچا تو کسی بات پر گھر والوں سے جھگڑا ہوا۔ لہٰذا مجھے ملازمت کرنا پڑی اور میں ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہو گیا۔ سکرپٹ رائٹر کے طور پر میں نے کچھ عرصہ کام کیا۔ اُن دنوں شعر کہنا میں نے شروع کر دیا تھا اور کچھ بزرگوں کو ہماری شاعری پسند بھی آئی۔ کچھ مدت بعد میں کراچی سے واپس پشاور آ گیا اور ریڈیو سے وابستہ رہتے ہوئے میں نے کالج میں بھی داخلہ لے لیا۔ پہلا ایم اے میں نے اُردو میں کیا، دوسرا ایم اے فارسی میں کیا۔ تیسرا ایم اے میں انگریزی میں کرنا چاہتا تھا۔ داخلہ بھی لے لیا لیکن مجھے کراچی جانا پڑا اور یہ معاملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ کراچی سے پھر پشاور آیا تو میں نے یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا اور پھر پاکستان نیشنل سنٹر میں ملازمت کر لی۔ ان دنوں یہ ادارہ سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت کے ایک رکن مولانا کوثر نیازی نے نیشنل سنٹر کو بالکل ہی سیاسی پلیٹ فارم بنا دیا جو اچھا اقدام نہیں تھا۔ میں نے نیشنل سنٹر میں حکومت کا آلہ کار بننے سے انکار کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے کئی بار برطرف بھی کیا گیا۔ جب یہاں سے مجھے برطرف کیا جاتا میں دوبارہ پشاور یونیورسٹی چلا جاتا اور جب بحال کیا جاتا تو پھر نیشنل سنٹر میں آ جاتا۔ اس طرح کئی بار ہوا۔ پھر جب اکیڈمی آف لیٹرز وجود میں آئی تو اس کا پہلا ڈائریکٹر جنرل مجھے بنایا گیا۔ ابھی اکیڈمی کے قیام کو تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ پھر جب میں نے ایک نظم پڑھی جس کا عنوان تھا ''میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے'' تو مجھے دو سال تک ملازمت سے برطرف رکھا گیا۔ پھر ایک دفعہ میں کراچی میں مشاعرے میں شرکت کے لیے گیا۔ وہاں نظمیں پڑھیں تو مجھے سندھ بدری کا حکم سنایا گیا۔ اس صوبہ بدری کے حکم پر میں نے احتجاجاً جلاوطنی کی زندگی اختیار کر لی۔ میرا موقف یہ تھا کہ پاکستان میرا وطن ہے تو پھر اس کے کسی مخصوص حصے یا علاقے میں جانے پر میں پابندی تسلیم کیوں کروں اور اگر مجھے اس بنیادی حق سے محروم کر دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میرے وطن کی زمین ہی مجھ پر تنگ کر دی گئی ہے۔ کل مجھ پر پنجاب کے دروازے بھی بند کیے جا سکتے تھے۔ پھر بلوچستان جانے پر بھی پابندی عائد ہو سکتی تھی۔

حکمرانوں کے اس طرح کے اقدامات ہی کی وجہ سے صوبوں کے درمیان نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے اقدامات کے خلاف احتجاج کے طور پر میرا

جلاوطنی کا فیصلہ میرے ضمیر کی آواز تھا۔

س: فراز صاحب! یہ اچھا ہوا کہ آپ نے مختصر سے سوال کے جواب میں بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی زندگی کے ماہ وسال کی کہانی بیان کر دی لیکن میری گزارش یہ ہے کہ ابتدا میں آپ جن ادبی شخصیات اور کتابوں سے متاثر ہوئے اُن کے حوالے سے بھی کچھ بتائیں؟

ج: میرے والد خود اردو، فارسی اور عربی کے عالم شخص تھے لیکن اُن کی تربیت سے فیض یاب ہونے کا موقع ہمیں کم ملا۔ کیوں کہ وہ درویش قسم کے انسان تھے لیکن اُن کی جو علمی، ادبی اور دینی کتابیں تھیں اُن سے ہم استفادہ کرتے رہے۔ پھر کچھ علمی اور ادبی لوگوں سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ اس طرح ادبی ذوق کی پرورش ہوتی رہی لیکن زیادہ ادبی فیض مجھے کراچی میں قیام کے دوران نصیب ہوا۔ وہاں چراغ حسن حسرت تھے، رفیع پیرزادہ، شاعر لکھنوی اور ذوالفقار بخاری تھے۔ ان سب بزرگوں سے ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ بعد میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے جو ادبی شخصیات تھیں۔ ان میں سردار جعفری تھے، سجاد ظہیر تھے۔ کیفی اعظمی، جان نثار اختر، ساحر لدھیانوی اور فراق صاحب تھے۔ یہ لوگ ہمیں بہت پسند تھے۔ ان کا کلام ہم پڑھا کرتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی ہیں۔ ان کے ساتھ تھوڑی بہت رنجش بھی رہی لیکن احترام کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ فیض صاحب کے ساتھ پہلے تو زیادہ موقع نہ ملا لیکن پھر ان سے ایسا تعلق استوار ہوا کہ ان کے فیضانِ نظر سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

س: آپ اپنے نظریۂ ادب کی کیا تشریح یا تعبیر کرتے ہیں؟

ج: ہمارے ہاں مختلف ادوار میں طویل عرصہ تک فوج کی حکومت رہی یا پھر نیم فوجی حکومت کا تجربہ یہاں کیا گیا۔ گھٹن کے اس ماحول میں جب عوام کو اُن کے حق حکمرانی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ایک حساس فنکار اپنے اردگرد کے ماحول سے آنکھیں بند کر کے شاعری نہیں کر سکتا۔ میری شاعری میرے ماحول کی عکاس ہے، اپنے فن کے گلی کوچوں کی آواز ہے۔ میرے نزدیک شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں۔ یہ اپنے حالات کی اگر صحیح تصویر پیش نہیں کرتی تو میرے نظریۂ ادب کے مطابق یہ شاعری نہیں ہے۔ میرا قلم زندگی کی جدوجہد میں شریک لوگوں کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔ اگر شاعر یہ کہے کہ ہمارا کام تو محض شعر کہنا ہے اور شعر میں یہ خوبی ہونی چاہیے اور وہ خوبی ہونی چاہیے۔ یعنی ادب برائے ادب ہونا چاہیے۔ میں اس نظریے کو مسترد کرتا ہوں۔ اب تو شاعری یہ ہو کر رہ گئی ہے کہ قلم حکمرانوں کے فرمودات اور سوچ کے مطابق گھسیٹا جائے۔ وہ مذہب کا پرچار کریں تو آپ بھی اُن کے پیچھے چل پڑیں۔ وہ لبرل ازم کے طرف دار ہوں تو آپ بھی اپنی شاعری میں لبرل ہو جائیں۔ شاعروں کو حکمرانوں کے اشارۂ ابرو پر اپنی سوچ کا رخ بدلنے کے بجائے اپنے ضمیر کے مطابق لکھنا چاہیے اور اپنے ضمیر و قلم کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے میں بھی پس وپیش سے کام نہیں لینا چاہیے۔ میں یہاں یہ واضح کر دوں کہ جہاں ہر دور میں موقع پرست اور شاہ کے وفادار شاعروں اور ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد موجود رہی ہے وہاں ایسے قابل فخر شعراء اور ادیب بھی ہمارے ہاں کم نہیں جو زندگی کے مسائل کے حوالے سے بڑی جرأت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

س: کسی تعصب کے بغیر پاکستان اور ہندوستان میں کی جانے والی شاعری کا اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو آپ کے خیال میں کس ملک کی شاعری بہتر ہے؟

ج: اچھی یا بری شاعری کسی ملک کے حوالے سے نہیں ہوتی۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اچھی اور بری شاعری ہو رہی ہے لیکن پاکستان اور ہندوستان کی شاعری میں فرق یہ ہے کہ ہندوستان میں آج پھر شاعری کا رُخ گل وبلبل کی طرف موڑا جا رہا ہے لیکن پاکستان میں زندگی کے مسائل اور مصائب کے حوالے سے شاعری ہو رہی ہے۔ ہمارے ہاں شاعروں کا تعلق دائیں بازو سے ہو یا بائیں بازو سے اُن کا تعلق ہو۔ دونوں نے زندگی کے مسائل کو اپنی شاعری کا حوالہ بنایا ہے۔ اسی لیے پاکستان کی شاعری میں ہندوستان کی شاعری کے مقابلے میں زیادہ قوت، زیادہ اپیل اور زیادہ تازگی موجود ہے۔

س: الزام لگایا جاتا ہے کہ ریاکاری اور منافقت کے پردوں کو چاک کرنے والا شاعر آج خود ریاکار اور منافق بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اچھا ادب تخلیق نہیں ہو رہا۔ آپ کے نزدیک اس الزام میں کس حد تک صداقت ہے؟

ج: میں صرف اُسے شاعر تسلیم کرتا ہوں جو ریاکاری اور منافقت کے خلاف ہو۔ شاعری میں محتسب، واعظ، زاہد اور شیخ کے جو سمبل استعمال ہوتے ہیں اور شاعروں کا ان کے خلاف جو احتجاجی اور تنقیدی رویہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر ان طبقوں کو جھوٹ، منافقت اور ریاکاری کا ایک پیکر خیال کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارا معاشرہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اخلاقی اقدار تباہ ہو چکی ہیں، سچ بولنے کی روایات دم توڑ چکی ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں زندہ رہتے ہوئے شاعر بھی اپنے ضمیر کو کب تک بچا سکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے کے بگاڑ کے سیلاب کے آگے ٹھہر سکتے ہیں اور فن کا بھرم قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے اہل قلم موجود ہیں جو لفظوں کی حرمت کا سودا نہیں کرتے، تحریر کے تقدس کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ جو شاعر اپنے فن کے ساتھ منافقت کرتے ہیں وہ عوام کی نظروں میں کبھی توقیر حاصل نہیں کر سکتے اور ان کا فن بھی زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

س: بعض شاعر اور ادیب سرکاری اداروں سے وابستہ ہیں اور حکومت کی پیروپیگنڈا مشینری کے بھی اہم کل پرزے ہیں۔ لیکن وہ خود کو حریتِ فکر کے علمبردار بھی کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ کبھی تھوڑا بہت سچ بول بھی لیتے ہیں لیکن حکمرانوں کی طرف سے خوف زدہ کرنے پر دوبارہ اربابِ اقتدار کی قصیدہ خوانی شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ نوکری اور سرکاری ملازمت دو متضاد رویے ہیں؟

ج: یہ بڑی مشکل بات ہوتی ہے کہ آپ سرکاری اداروں سے بھی وابستہ ہیں اور اپنی حریتِ فکر کے سرمائے کو محفوظ بھی رکھ سکیں۔ جو لوگ سرکاری

ملازمت میں رہ کر سچے لفظوں کا کاروبار کرتے ہیں تو پھر اس کے نتائج بھی اُن کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ مَیں خود سرکاری ملازمت میں ہوں لیکن اپنی آزادئ رائے پر میں نے کبھی کوئی قدغن قبول نہیں کی۔ ہمارے سوچنے اور لکھنے والے لوگوں کو سرکاری ملازمتوں میں ضرور شامل ہونا چاہیے۔ یہ ملک کسی طبقے کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ سب کا ملک ہے اور اس پر لکھنے والوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی حکمران کا ہوسکتا ہے۔ سول یا فوجی بیوروکریسی کا ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں یہ کہتا ہوں کہ نوکری اور شاعری دو متضاد رویے نہیں ہیں۔ آپ کو اگر اپنی تعلیمی صلاحیت کی بنیاد پر کسی سرکاری ادارے میں کوئی نوکری ملتی ہے۔ حتیٰ کہ انٹیلی جنس میں بھی کوئی نوکری ہے تو اُسے ضرور قبول کریں۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھ لیں کہ ماچس بنانا تو کوئی قابلِ اعتراض کام نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ ماچس سے کسی کا گھر جلاتے ہیں یا کسی کی املاک تباہ کرتے ہیں تو اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح محض سرکاری ملازمت میں جانے کو تو جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور پھر ہمارے جیسے پسماندہ ملک میں ملازمتوں کے علاوہ روزگار کے اور مواقع بھی نہیں ہیں۔ لیکن کسی بھی شخص کے جو خیالات ہیں، جو اُس کی سوچ ہوتی ہے اُس پر پہرے نہیں بٹھانے چاہئیں۔ جس طرح ہر سرکاری ملازم کو اپنی پسند کی جماعت کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے اسی طرح وہ آزادانہ سوچ رکھنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ کیوں کہ سوچ موجود ہوگی تو وہ ووٹ دینے کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ اگر سوچ ہی نہ ہوگی تو وہ یہ فیصلہ کیسے کرے گا کہ کس کو ووٹ دوں یا کس کو ووٹ نہ دوں۔ جو لوگ نوکری کو اپنی فکر پر حاوی ہونے دیتے ہیں اُن پر مجھے اعتراض ہے۔ جو لوگ ۔۔۔ صبح اُٹھ کر آدھا پاؤ مکھن حکمران کی ایک مونچھ پر لگاتے ہیں اور آدھا پاؤ مکھن دوسری مونچھ پر لگاتے ہیں اور خود کو شاعر یا ادیب بھی کہتے ہیں۔ انہیں میں شاعر یا ادیب نہیں مانتا۔ نوکری کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آپ اپنے ضمیر کا سودا کریں، اپنے افکار کا خون کریں، اپنے الفاظ کی حرمت کو بیچ ڈالیں۔ یہ نوکری نہیں بے حمیتی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کو نوکری اور بے حمیتی میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جو لوگ اس فرق کو مٹا دیتے ہیں وہ عوام کی عزت اور احترام سے محروم ہو جاتے ہیں۔

س: آپ کے خیال میں نئی شاعری کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے اور اس عہد کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟

ج: میرے نزدیک تو نئی شاعری کا آغاز غالب ہی سے ہو جاتا ہے۔ پھر حالی اور آزاد کا جو دور ہے وہ بھی نئی شاعری کا دور ہے۔ پھر فیض، راشد اور میراجی کا جو دور ہے۔ دوسرے ترقی پسند شعراء بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ سب لوگ بڑے عالم تھے اور میرے دل میں ان سب کا بہت احترام ہے۔ ان سب لوگوں نے جدید شاعری ہی کو معتبر نہیں بنایا بلکہ بہت سے نئے لکھنے والوں کی بھی اپنے فن کے ذریعے رہنمائی کی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو سب سے بڑا شاعر قرار دینا میرا منصب نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ سب لوگ اپنے اپنے دائرے میں باکمال تھے۔ ایک نام میں بھول گیا تھا وہ نام ہے مجید امجد کا۔ نئی شاعری میں ان کا نام اور مقام بہت بلند ہے۔ البتہ فیض صاحب نئی اردو شاعری میں واحد شاعر ہیں جن کے کلام کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔

س: اچھی شاعری جذبے اور عشق کی مرہونِ منت ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

ج: کسی مقصد یا مشن کے ساتھ وابستگی بھی عشق ہوتا ہے اور عشق ذاتی سطح پر آپ اپنے روحان کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں حوالوں سے شاعری کی جاتی ہے۔ زندگی میں عشق کی آگ ایک سے زائد مرتبہ آپ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ پھر شعوری سطح پر تبدیلی کے ساتھ آپ کے عشق کے معیار اور ہدف بھی بدل سکتے ہیں۔ اس عشق اور جذبے کی شدت سے یقیناً بلند پایہ شاعری وجود میں آتی ہے اور کسی عشق اور جذبے کے بغیر جو شاعری کی جاتی ہے اُس کی حیثیت بے روح جسم سے زیادہ نہیں ہوتی۔

س: کیا آپ نے کبھی اپنی شاعری کا تجزیہ کیا؟

ج: خود تنقیدی کا جو عمل ہے وہ تخلیق سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ قاری تک جو اشعار پہنچتے ہیں وہ کئی مراحل سے گزر کر اشاعت کے قابل قرار پاتے ہیں۔ جس طرح ایک اخبار یا جریدہ طباعت کے لیے بھیجنے سے پہلے آپ اچھی طرح اطمینان کر لیتے ہیں کہ اس میں زبان، واقعات اور پروف کی کوئی غلطی موجود نہ ہو۔ اسی طرح ہم ایک شعر کو مشاعرے میں پڑھنے یا کتاب میں شائع کرنے سے پہلے اُس کے الفاظ، وزن اور شعریت کا پوری طرح جائزہ لیتے ہیں اور اپنی حد تک مطمئن ہونے کے بعد اسے قاری یا سامع کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی شاعری سے خود مطمئن نہیں تو دوسروں کو مطمئن کیسے کریں گے۔

س: آپ کی شاعری کو بہت زیادہ پسند کیا گیا ہے۔ آپ کی ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے نزدیک اس کی وجہ کیا ہے؟

ج: میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے۔ مجھ میں تو کوئی خوبی نہیں ہے۔ البتہ میں نے اپنے قلم اور نظریات سے کبھی بددیانتی نہیں کی۔ شاید میری شاعری سے زیادہ اپنے نظریات سے میری وابستگی لوگوں کو بہت اچھی لگی۔ میں نے کسی دباؤ یا لالچ میں آ کر اپنی روش کو تبدیل نہیں کیا۔ اب جس طرح آپ نے کہا ہے کہ لوگوں نے میری شاعری کو بہت زیادہ پسند کیا ہے۔ یہی میرا سب سے بڑا انعام ہے اور اس انعام کے مقابلے میں مجھے دنیا کے تمام مفادات ہیچ نظر آتے ہیں۔

س: آپ نے اردو کے علاوہ کبھی اپنی مادری زبان پشتو میں بھی شاعری کی ہے؟

ج: مجھے آپ کے اس سوال پر بڑی ندامت محسوس ہوئی ہے۔ ایک دفعہ ریڈیو پر میرا ایک انٹرویو نشر ہوا تھا جس میں مَیں نے بتایا تھا کہ میں نے صرف اردو زبان میں شاعری کی ہے۔ تو انٹرویو سننے والی ایک پٹھان خاتون نے مجھے ریڈیو کی وساطت سے خط لکھا جس میں مجھے بہت زیادہ گالیاں دی گئیں کہ میں نے پشتو میں شاعری کر کے اپنی مادری زبان پشتو کا حق ادا کیوں نہیں کیا۔ بہرحال مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے اردو کے ساتھ ساتھ پشتو زبان میں شاعری کیوں نہیں کی۔

ڈاکٹر نجیب جمال

س: آپ شاعر ہیں، نثر بالخصوص تنقید، تحقیق اور ادب کی دیگر اصناف میں بھی تخلیقی کام کیا ہے۔ ان اصناف میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی ہے؟

ج: بنیادی طور پر میرا دل سب سے زیادہ شاعری کے نزدیک رہا ہے۔ میں نے 1976ء میں بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا تھا اور اب تک میں نے شاعری کو زیادہ رغبت سے پڑھا اور پڑھایا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بہت شعر کہے۔ انٹر کالجیٹ مشاعروں میں کئی ٹرافیاں اُٹھائیں مگر پھر میرے اندر کا نقاد غالب آتا گیا اور اس نے ہی مجھے سمجھایا کہ نوجوانوں کے جذبات سے کھیلنے کے بجائے کچھ منفرد، کچھ بہتر اور کچھ سب سے الگ کہنے کے لیے بقول میر صاحب:

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعہ تر کی صورت

سو میں نے شاعری ترک کی مگر شاعری سے دل بستگی برقرار رہی اور اب تک ہے۔ بعد ازاں میں نے جتنی بھی تنقید لکھی، اس کا موضوع شاعری ہی رہا۔ تاہم کلاسیکی شاعری پر توجہ زیادہ رہی۔ میری کچھ کتابوں ''اردو شاعری کی تہذیب''، ''پنج آہنگ''، ''ماہ و سال عندلیب'' (غالب کی شاعری اور فن پر مضامین) اور ''ہمارا اقبال'' کا موضوع کلاسیکی شاعری کا آہنگ ہی ہے۔ تنقید سے میں تحقیق کی طرف گیا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ یگانہ کے بارے میں لکھا۔ ڈگری تو 1988ء میں ملی۔ مگر یہ شائع 2013ء میں ہوا اور اسی سال اس پر یو بی ایل ایکسی لنس ادبی ایوارڈ ملا۔ یوں مجموعی طور پر اٹھارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ کتابیں مدون بھی کیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے تحقیق و تنقید ہی اب میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ تحقیق و تنقید میرے نزدیک اعلیٰ درجے کی سنجیدگی اور یکسوئی کا تقاضا کرتی ہیں۔ جس کے لیے مطالعہ، محنت، عرق ریزی اور لگاؤ کی ضرورت ہے یعنی یہ ''وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا''، تخلیقی سطح پر کچھ کام شخصیت نگاری اور یک بابی ڈراما کی صورت کیا رکھا ہے۔

س: بچپن کہاں گزرا؟ گرد و پیش کے حالات کیسے تھے؟

ج: میں ۳ مئی ۱۹۵۲ء کو لائل پور میں پیدا ہوا۔ میرے والد عبدالمجید وہاں لائل پور کاٹن ملز میں ٹیکسٹائل کے شعبے سے وابستہ تھے۔ لائل پور کاٹن ملز دراصل دہلی کلاتھ ملز کی ایک شاخ تھی اور اوائل بیسویں صدی میں قائم ہوئی تھی۔ میرے والد قیام پاکستان سے قبل دہلی سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آ گئے تھے۔ تاہم میرے دادا، دادی، والدہ اور دیگر افرادِ خانہ پاکستان بننے کے بعد لائل پور منتقل ہوئے۔ جہاں ہماری رہائش ملز کی کالونی میں تھی۔ میں نے ابتدائی تعلیم ایل سی ایم ماڈل ہائی سکول لائل پور سے ہی حاصل کی۔ میٹرک اسی سکول اور پھر ایف ایس سی گورنمنٹ کالج سے کیا۔ میرے بچپن کی خاص بات لائل پور کاٹن ملز کا سالانہ مشاعرہ تھا جو ہر سال مارچ کے مہینے میں سالانہ میلے کے ساتھ منعقد ہوتا تھا اور جس میں اس وقت کے تمام ممتاز اُردو شعراء اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے دنوں میں جگر، اصغر، جوش، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجروح، ساحر وغیرہ کو یہیں پر دیکھا اور سنا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنی معروف نظم ''پتھر'' اسی سالانہ مشاعرے میں سنائی تھی۔ پھر ہر سال ''پتھر'' پتھر کی آوازیں سنائی دیتیں اور قاسمی صاحب اپنی نظم ''پتھر'' سے شعر سنانا شروع کرتے۔ فیض صاحب کی زبانی ''مجھ سے پہلی سی محبت'' اور جوش صاحب سے ''فتنہ خانقاہ'' ساحر سے ''چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں'' (بعد میں فلم کا حصہ بنی) بھی میرے حافظے کا حصہ ہیں۔ قاسمی صاحب کو جب میں نے بتایا کہ پانچ سال کی عمر میں میں نے ''پتھر'' سنی تھی اور پھر ہر سال سننے کی وجہ سے وہ نظم میرے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی تو وہ میرا تعارف ہی نظم ''پتھر'' کے پہلے سامع کے طور پر کرایا کرتے تھے تو اس طرح میرا بچپن گزرا۔

س: ادب و صحافت سے شوق کی ابتدا؟

ج: یہ تو کہنا بہت مشکل ہے کہ ادب سے شوق کی ابتدا کب ہوئی۔ بچپن ہی سے کچھ چیزوں کو پڑھنے کی چاٹ لگ گئی تھی۔ گھر میں سب بہن بھائیوں کے لیے بچوں کے رسائل نظم و تربیت، کھلونا اور بچوں کی دنیا خریدے جاتے تھے۔ مجھے بھی کہانی لکھنے کا شوق ہوا۔ جس کہانی نے بہت متاثر کیا۔ وہ عزیز اثری کی لکھی ہوئی ''عالی پر کیا گزری'' تھی۔ میرے بڑے بھائی کو جاسوسی ناول اور خاص طور پر ابن صفی کے ناول پڑھنے کا چسکا تھا۔ ہر ماہ عمران سیریز اور فریدی سیریز کے دو ناول شائع ہوتے تھے جنہیں میں اپنے بھائی سے بھی پہلے پڑھ چکا ہوتا تھا۔ خود اپنے ہاتھ سے بچوں کا ایک مکمل رسالہ لکھا کرتا تھا۔ شروع ہی سے خوش خط تھا اس لیے یہ کام بہت شوق سے کرتا اور ہم جماعتوں کو وہ رسالہ پڑھواتا تھا۔ آٹھویں جماعت میں سکول کی بزمِ

ادب کا صدر منتخب ہوا اور میٹرک تک مسلسل تین سال تک رہا۔ اس زمانے میں سکول میں اردو کے استاد شوکت موہانی جو حسرت موہانی کے رشتہ دار بھی تھے اور اردو، انگریزی کے معروف نقاد اور شاعر افسر ساجد کے ماموں تھے، نے میری خصوصی تربیت اور رہنمائی کی ابتدائی طور پر شعر و نثر کی قرأت کا قرینہ میں نے انہی سے سیکھا۔

س: اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج: میری پہلی کتاب ''غالب شکن اور یگانہ'' یگانہ کی معروف زمانہ تصنیف ''غالب شکن'' کی تدوین پر مشتمل تھی جسے کاروانِ ادب ملتان نے شائع کیا۔ اس کے بعد تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''نگاہ'' اور ''محاسن'' کے عنوان سے بیکن بکس ملتان سے شائع ہوئے۔ پانچ کلاسیکی شاعروں (ولی، آتش، غالب، مومن اور یگانہ) پر ''پنج آہنگ'' اور غالب پر ماہ و سال عندلیب کے ٹائٹل سے دو کتابیں سطور پبلی کیشنز ملتان نے اور بہلول کے چھے شاعروں پر کتاب ''شش جہات'' اور قیام مصر (۲۰۰۲-۱۹۹۸ء) کے دوران وہاں ادبی کانفرنسوں میں پڑھے گئے بارہ تحقیقی و تنقیدی مضامین ''ندوۃ النسل'' کے عنوان سے دو کتابیں اردو اکیڈمی بہاول پور نے شائع کیں۔ تین کتابیں اظہار سنز لاہور سے شائع ہوئیں۔ ان کے نام بالترتیب ''کتاب سے پہلے'' (ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اپنی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں کی تدوین) ''کتاب کے بعد'' (ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر دیباچے) اور ''یگانہ: تحقیق و تنقیدی مطالعہ'' (پی ایچ ڈی کا مقالہ) ہیں۔ یگانہ کے کلام کا انتخاب نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کیا۔ عرب طالب علموں کے لیے ایک کتاب ''آیئے اردو بولیں'' مصر میں پاکستان کے سفارت خانے نے شائع کی۔ دو کتابیں ''امیر خسرو سے میر حسن تک'' اور ''الشعر الاردی'' بھی مصر کے مطابع ''الکمال'' سے شائع ہوئیں۔ ''اردو شاعری کی تہذیب'' کو چولستان علمی و ادبی فورم بہاول پور نے شائع کیا۔ ان کے علاوہ دو سو سے زاید تحقیقی و تنقیدی مضامین نقوش، فنون، اوراق، ماہِ نو، غالب، الحمرا، قومی زبان و دیگر رسائل کے علاوہ جامعات کے ہائر ایجوکیشن سے منظور شدہ خبر نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ ادبی خدمات کے سلسلے میں حکومت پاکستان نے صدارتی ایوارڈ تمغہ امتیاز 2016ء میں عطا کیا۔ استنبول یونی ورسٹی نے 2015ء میں اردو کی سو سالہ تدریس کے موقع پر بین الاقوامی اردو کانفرنس کے موقع پر لائف ٹائم ایوارڈ بھی دیا۔

س: کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

ج: میں ذہنی طور پر ترقی پسند تحریک کے قریب تر رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ اب چوں کہ ترقی پسندوں کے کئی دھڑے بن چکے ہیں اس لیے عملاً باقاعدگی کا سلسلہ تو قائم نہیں ہے۔ تاہم وابستگی اور دلچسپی کا عالم پہلے جیسا ہے۔ درحقیقت میری ادبی تربیت میں فیض، جذبی، ساحر، ندیم، مجاز، مجروح، مخدوم، اختر الایمان، جاں نثار اختر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، سبط حسن، علی سردار جعفری، احتشام حسین، علی عباس حسینی، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اہل قلم معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہیں۔ انہیں بہرصورت سیاسی و سماجی صورتِ حال کو موضوع بنانا چاہیے۔ تاہم کسی پروپیگنڈے یا نظریے سے بالاتر ہو کر یہ کام صورتِ احوال کے پیش نظر سمت نمائی کے نقطہ نظر سے کرنا چاہیے۔ آج سے تین سو سال پہلے میر و سودا کی شاعری اس کی مثال ہے۔

س: کہا تو یہ جا رہا ہے کہ شاید کتابوں سے عشق کی یہ آخری صدی ہے۔

ج: مگر میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ تاہم جہاں کتاب کی ماہیت میں تبدیلی آ رہی ہے وہاں کتب بینی کے قرینے بھی بدل رہے ہیں۔ ہمیں ان تبدیلیوں کو ڈیجیٹل دور کے تقاضوں کے مطابق قبول کرنا ہوگا۔ الیکٹرانک میڈیا نے ہی نہیں کارپوریٹ کلچر اور ہائپر رئیلٹی (تشکیلی حقیقت) کے تصورات نے بھی میڈیا کو بہت طاقت ور بنا دیا ہے۔ مگر لکھے ہوئے لفظ کی تاثیر ابھی تک قائم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے دور میں لکھے ہوئے لفظ کے مستند معنی کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ اب متن کے نامختتم معنی یا معنی کے تسلسل کا زمانہ ہے۔ اسی وجہ سے نئے نئے علوم جنم لے رہے ہیں اور کثرت آرائی کا تصور جنم لے رہا ہے۔ اب اکہرے متن، اکہری شخصیت اور اکہری زندگی کا زمانہ گزر چکا ہے۔

س: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج: تخلیقیت کے بارے میں میں بہت واضح تصور رکھتا ہوں۔ یہ وہ جوہر ہے جو تخلیق حسن اور معنی آفرینی کو بیک وقت پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین کرتا ہے اور ہمارے شعورِ حیات میں اضافہ کرتا ہے۔ زندگی کو ہمارے لیے گوارا ہی نہیں شایانِ شان بناتا ہے۔ ایک اچھا تخلیق کار اسی عمل سے ہمارے دکھوں، محرومیوں، تنہائیوں، حسرتوں اور المیوں کا مداوا کرتا ہے اور زندگی کو ہمارے لیے آسان بناتا ہے۔

س: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج: یہ درست ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے کہ نارسائی کا دکھ شاید زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے۔ مگر اس کے باوجود تخلیق کار کے لیے تخلیقی کرب سے گزرنے کے بعد آسودگی کا لمحہ آتا ہے جب اسے اطمینان ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا وہ اسے کہہ سکا ہے۔ یہی معاملہ تحقیق اور تنقید کا بھی ہے کہ جو نا معلوم اور نادریافت شدہ حقیقتوں کا سراغ لگاتی ہے۔ یافت کا لمحہ ہی زندگی کی سطح پر بامرادی کا احساس جگاتا ہے اور سرشاری طاری کرتا ہے۔

س: عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے ہوا؟

ج: میں نے ایم اے اردو گورنمنٹ کالج ملتان جواب ایمرسن یونی ورسٹی ہے، سے 1974 میں کیا۔ 1975 میں ملتان یونی ورسٹی قائم ہوئی تو میں اس میں اردو کا لیکچرار منتخب ہو گیا۔ اس کے بعد 1995ء میں پروفیسر اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ہو کر اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور چلا گیا۔ 1998ء میں حکومت پاکستان نے اردو چیئر پر منتخب کے چار سال کے لیے جامعہ ازہر مصر بھیج دیا۔ واپسی پر اسلامیہ یونی ورسٹی میں اپنی ریٹائرمنٹ (2012ء) تک ڈین فیکلٹی آف آرٹس رہا۔ بعد ازاں اسلامک انٹرنیشنل یونی ورسٹی اسلام آباد میں دو سال چیئرمین شعبہ اُردو رہنے کے بعد تا حال فارمن کرسچن کالج یونی ورسٹی میں اُردو کے پوسٹ گریجویٹ پروگرام کا انچارج ہوں۔

س: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

ج: لکھنا لکھانا خالصتاً اندرونی معاملہ ہے۔ لکھاری سب سے پہلے اپنی ذات کے اسرار جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے داخل میں جھانکتا ہے اور اپنے باطن کا سراغ پانے کی کوشش کرتا ہے۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے:

ایک دل کو ہزار داغ لگا
اندرونے میں جیسے باغ لگا

ایک تخلیقی فن کار کے اندر یہ سب داغ روشن ہو کر چراغاں کرتے ہیں اور وہ ان کی روشنی میں سب سے پہلے اپنی ذات کو جگمگ ہونے کا نظارہ کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد زمانہ، زندگی، مطالعہ، کمٹ منٹ، تربیت اور ریاض اس کے جوہر کو چمکاتے ہیں۔ دہشت کلکتوی کا کیا عمدہ شعر ہے:

فروغِ طبع خداداد ہے مگر وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لیے

س: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج: سوشل میڈیا کا کردار دو دھاری تلوار کی طرح ہے۔ اس میں موجود شدت اور بے بنیاد خبریت نے اس کے کردار کو مشکوک بنا دیا ہے۔ اسلم انصاری کا ایک شعر ہے:

ہمارے عہد کی نیکی ہے نرمیٔ گفتار
صبا کے لہجے میں تم حرفِ دل نشیں کہنا

یوں لگتا ہے کہ سوشل میڈیا نے ہمیں اس نیکی سے محروم کر دیا ہے۔ تاہم اس کا مثبت رخ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بعض غیر معروف، نوجوان یا کم وسائل رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم میسر آ رہا ہے اور ہر طرح کی تخلیقات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ معیار دراصل مقدار ہی سے جنم لیتا ہے۔ کئی نو آموز لکھنے والوں کو میں سوشل میڈیا کے ذریعے معروف ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اس سے جہاں ابتدا ہی میں کچھ لوگوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے وہاں کئی لکھنے والے سنجیدگی سے آگے بھی بڑھ رہے ہیں۔

س: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فن کار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

ج: فن کا سلسلہ بھی عجیب ہے۔ یہ اپنی ذات سے شروع ہو کر زمانے پر محیط ہو جاتا ہے اور ذات میں ہی زمانے کی نمود کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ میرؔ نے اس سلسلے میں کمال کی بات کہہ رکھی ہے:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

یعنی شعر کو انہوں نے راہِ سخن بنایا تھا مگر رفتہ رفتہ ان کی ذات پیچھے ہوتی گئی اور ان کا فن نمودار ہوتا گیا۔ گویا ذاتی تجربات و مشاہدات ہی بالآخر آفاقیت میں ڈھلتے ہیں اور فن کا چہرہ نکھرتا جاتا ہے۔

س: کیا کھویا؟ کیا پایا؟

ج:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

س: ایف سی کالج میں پڑھانے کا تجربہ کیسا رہا؟

ج: میں نے اب تک پبلک یونی ورسٹیوں میں پڑھایا ہے۔ ایف سی سی یو میں امریکن مینجمنٹ کے ساتھ پرائیویٹ سیکٹر یونی ورسٹی میں پڑھانے کا تجربہ تھا۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ پرفارمنس کی بنیاد پر استاد کی گریڈنگ کیسے ہوتی ہے۔ ایف سی سی یو پاکستان بھر میں لبرل آرٹس ایجوکیشن کا بڑا ادارہ ہے۔ اس ادارے سے انسلاک میری خوش بختی ہے۔

بقیہ انٹرویو: جمیل یوسف

س: آپ نے شاعری کس عمر میں شروع کی۔ کچھ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

ج: شاعری کا شوق مجھے دس گیارہ سال کی عمر میں لگ گیا تھا۔ جب میری پہلی غزل چھپی تو میں اسلامیہ ہائی سکول چکوال میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس سے قبل بچوں کے رسالوں میں میری نظمیں چھپ رہی تھیں۔

سکول کے زمانے میں ہی مجھے غالب کا اکثر کلام فیض کی نقش فریادی اور دست صبا حفظ ہو گئے تھے۔ حفیظ کا مجموعہ نغمہ زار اور شاہ نامہ اسلام کے اکثر حصے مجھے ازبر ہو گئے۔ غالب اور میر کے مطالعے سے میرے ذہن میں شعر کا جو ایک معیار قائم ہو گیا بس میں اس کو سامنے رکھ کر مشق سخن کرتا رہا۔

س: ان شعراء کے علاوہ دوسرے شعراء بھی آپ کے زیر مطالعہ رہے؟ باقی شعراء کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ج: کالج میں ایک وقت تھا کہ سیف الدین کی خم کاکل نے مجھے بڑا مسحور کیا۔ پھر اقبال کا مطالعہ کیا۔ اقبال ایسا عظیم شاعر ہے جس سے متاثر تو سب ہو سکتے ہیں مگر اس کے رنگ میں شعر لکھنا اور اس کی تقلید کرنا اور جو روایت اس نے قائم کی اس پر چلنا ممکن نہیں۔ فیض نے ایک مرتبہ اقبال کے بارے میں کہا تھا کہ اقبال ایک پہاڑ کی مانند ہے اور ہم اس پہاڑ کے قدموں میں بچوں کی طرح کھیل رہے ہیں۔ ان ہی دنوں میں یوسف ظفر، مجید امجد، ن۔ م راشد، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، باقی صدیقی سے متعارف ہوا۔ وزیر آغا ان دنوں ادبی دنیا میں جدید شعراء پر اپنے مضامین لکھ رہے تھے جو بعد میں نظم جدید کی کروٹیں کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے میرے اندر جدید اردو نظم کی تفہیم پیدا ہوئی۔

س: یہ جو حفیظ نے کہا ہے:

حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

تو آپ کے خیال میں یہ اہل زبان کا مسئلہ کیا ہے، کیا پنجاب کے رہنے والے اہل زبان نہیں ہیں؟

ج: میں اس سلسلے میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ جب میں 1968ء میں چٹاگانگ گیا اور وہاں کے ایک مشاعرے میں اپنی غزل سنائی وہاں کے اہل زبان شاعروں سے متعارف ہوا اور ان سے بے تکلفی کے ماحول میں گپ شپ کا سلسلہ چلا تو ایک بزرگ شاعر مجھے کہنے لگے جمیل صاحب آپ تو شاعری کو سمجھتے ہیں۔ سچ سچ بتائیں کیا واقعی اقبال کو شاعر سمجھتے ہیں؟ میں نے بے ساختہ جواب دیا ''جی نہیں ہم اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے۔ ہم تو اقبال کو ''ولی'' سمجھتے ہیں۔ شاعر تو مجھ جیسے اور آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اتنی بڑی شخصیت تھی کہ اس نے بڑے بڑوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ جوش تو رہے ایک طرف علامہ مشرقی جیسی نابغہ روزگار شخصیت کو بھی اقبال نے متزلزل کر کے رکھ دیا اور وہ اپنا خاص میدان چھوڑ کر اقبال کے تتبع میں شائع کرنے لگے اور بانگ درا اور ضرب کلیم اور بال جبریل کی تقلید میں شعری مجموعے لکھ کر چھپوا ڈالے۔ یہ ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ علامہ مشرقی نے ضرب کلیم کے تتبع میں اپنا جو مجموعہ ''حرف کلیم'' کے نام سے چھپوایا اُس کے پیش لفظ میں لکھا کہ اقبال خواہ مخواہ اتنا بڑا شاعر بنا ہوا ہے۔ حالانکہ اس طرح کی شاعری کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس لیے اہل زبان کی اقبال پر انگشت نمائی سمجھ میں آتی ہے۔ جہاں تک حفیظ جالندھری کا تعلق ہے زبان و بیان پر جتنی قدرت حفیظ جالندھری کو حاصل تھی شاید کسی پنجابی نژاد اردو شاعر کو حاصل ہو۔ مولانا ظفر علی خاں ایک اور ایسے ادیب اور شاعر تھے کہ اہل زبان، زبان سیکھنے کے لیے ان کے قدموں میں بیٹھیں تو مناسب ہوگا۔ دراصل اہل پنجاب کے لیے اُردو کوئی دوسری یا اجنبی زبان نہیں بلکہ پنجابی کی ہی علمی و ادبی شکل ہے۔ پنجاب کے رہنے والے پنجابی بولتے ہیں مگر اپنا سارا لکھنا، پڑھنا اُردو میں کرتے ہیں۔ بالکل منٹو کی طرح، منٹو گفتگو ہمیشہ پنجابی میں کرتا تھا۔ مگر افسانے اردو میں لکھتا تھا۔ گویا ہمارے لیے اردو پنجابی کی تحریری صورت ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس طرح اہل پنجاب کی مادری زبان یعنی پنجابی کتابی اُردو سے مختلف ہے۔ بالکل اسی طرح اہل زبان کی مادری زبان کتابی اردو سے مختلف ہے۔ مجید لاہوری نے اسی نکتے کی وضاحت کی خاطر ایک مرتبہ اہل زبان کی زبان میں ایک غزل لکھی تھی اور اسے اپنے ہفت روزہ نمکدان میں اسی عنوان کے تحت شائع کیا تھا۔ ''اہل زبان کی زبان میں ایک غزل''، مطلع ملاحظہ ہو:

وفاؤں کے بدلے جفا کر رہا اے
میں کیا کر رہا اوں تو کیا کر رہا اے

اسی لیے میرا موقف یہ ہے کہ پنجابیوں کے لیے اردو بھی اتنی ہی ان کی اپنی زبان ہے جتنی کہ اہل زبان کے لیے۔

س: غالب کی زبان بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج: آپ غور فرمائیں غالب نے جس زبان میں شاعری کی ہے کیا وہ وہی زبان نہیں جو اقبال، فیض اور مجید امجد کی زبان ہے۔ ظفر اقبال، شہزاد احمد اور منیر نیازی کی زبان ہے۔ غالب نے اس زبان میں ہرگز شاعری نہیں کی جو دہلی اور لکھنو کے باقی شعراء کی زبان تھی۔ اسی لیے تو غالب کے اسلوب اور زبان و بیان پر سب چونک پڑے تھے اور غالب کو تسلیم کرنے میں اہل زبان کو وہی دقت پیش آئی جو اقبال کو تسلیم کرنے میں آئی۔ اسی لیے میں غالب کو لاہوری سمجھتا ہوں۔

س: کیا آپ نے کسی سے اصلاح لی تھی؟

ج: جہاں تک شاعری کا تعلق ہے کسی اُستاد سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی۔ بہرحال میرے اساتذہ نے شعر گوئی میں حوصلہ افزائی کی اور شعر و ادب کے مطالعہ میں میری رہنمائی کی۔ اسلامیہ ہائی سکول چکوال میں جو میرا مکتب تھا، ایک محترم استاد جناب نور حسین وفا تھے۔ وہ میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ جناب نور حسین وفا نے مجھے آٹھویں جماعت میں دیوانِ غالب کا بیشتر حصہ سبقاً سبقاً وضاحت سے سمجھا کر پڑھا دیا تھا۔ یہ محنت انہوں نے محض میرے ذوق کو دیکھتے ہوئے گوارا کی۔ ورنہ ظاہر ہے یہ کورس کا حصہ نہ تھا۔ دیوانِ غالب بھی عجیب مجموعہ ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس پر سر دھن رہا ہوں۔ اس کا مطالعہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ بقول غالبؔ:

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشم بینا کا

میں بلا جھجک دیوانِ غالب کو دنیا کا سب سے بڑا شعری کارنامہ سمجھتا ہوں۔

س: کیا آپ غالبؔ کو شیکسپیئر اور حافظ سے بھی بڑا شاعر سمجھتے ہیں؟

ج: شیکسپیئر کی عظمت میں کوئی شبہ نہیں، مگر بنیادی طور پر وہ ڈرامہ نگار ہے۔ اس کے ڈراموں میں عظیم شاعری کے جو ٹکڑے ہمیں ملتے ہیں ان کا تاثر بڑی حد تک ڈرامائی کیفیت کی وجہ سے ہے۔ قاری یا سامع پر ان کی شاعرانہ گرفت کہانی کے تسلسل اور ڈرامائی پس منظر کی مرہونِ منت ہے۔ اگر ان کو اپنی جگہ سے اُٹھا کر الگ رکھ دیا جائے اور سیاق و سباق کے علم کے بغیر ان کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے اثر میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس کے برعکس غالب کی شعری دنیا بالکل مختلف ہے۔ وہ کسی کہانی یا پلاٹ کا سہارا نہیں لیتا۔ تمثیلی طور پر یا استعارتاً کسی تاریخی یا اساطیری واقعہ کا حوالہ دینا ہو تو محض ایک لفظ سے سارا پس منظر اُجاگر کر دیتا ہے۔ غالب غزل کے صرف دو مصرعوں میں اور بعض اوقات صرف ایک مصرع میں وہ بے پناہ تاثر پیدا کر دیتا ہے جس کے لیے شیکسپیئر کو کہانی کے کئی مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ دیوان حافظ میں موضوعات کا تنوع نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر حافظ کی غزل کو معرفت کا کلام سمجھا جائے جیسے مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی کتاب عرفانِ حافظ میں دکھایا ہے تو بھی اُس کی شاعری کا کینوس خاصا محدود ہے اور وہ صرف داخلی تجربے کی واردات بن کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال اشرف علی تھانوی صاحب کی تشریح خاصی دور از کار ہے۔ علامہ اقبال کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ غالب کی شاعری انفس و آفاق کو محیط ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر چھائی ہوئی ہے۔

س: آپ شاعری میں کس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں؟

ج: صاحب شاعر کسی مکتبہ فکر کے تابع نہیں ہوتا۔ اس کا مقام مکتبہ ہائے فکر سے بلند ہے۔ وہ تو خود ایک نئے مکتب فکر کو جنم دیتا ہے۔ شاعر کو تو تلمیذ الرحمان کہا گیا ہے۔

س: آج کل پاکستانی ادب کا موضوع زیر بحث ہے اور مختلف آراء سامنے آ رہی ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: اس سوال کا ایک سیدھا سادا اور سچا جواب تو یہ ہے کہ جو ادب پاکستان میں تخلیق ہوا وہ پاکستانی ادب ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگلستان میں تخلیق ہونے والا ادب انگریزی ادب کہلاتا ہے اور امریکہ میں لکھا جانا والا ادب امریکی ادب کہلاتا ہے۔ حالانکہ دونوں کی زبان ایک ہے۔ جہاں تک پاکستان کا معاملہ ہے پاکستان محض ایک ملک کا نام نہیں بلکہ ایک نظریے کا نام ہے۔ اس لیے پاکستانی ادب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس نظریے کا حامل ہو اور ان صداقتوں اور ان دائمی اقدار کا آئینہ دار ہو جن کا علمبردار یہ نظریہ ہے۔ اس حوالے سے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حالیؔ، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور اسی صف کے جملہ اکابرین نے جو ادب تخلیق کیا ہے وہ اگرچہ پاکستان کی علاقائی حدود کے اندر تخلیق نہیں ہوا مگر پھر بھی وہ سب پاکستانی ادب کا حصہ ہے۔

س: جدید غزل نے جو ارتقائی کروٹیں لی ہیں، ان میں نئی علامات، تراکیب اور تمثیلی انداز فکر کا کیا کردار ہے؟

ج: شاعری محض علامات، تراکیب اور تمثیلی اندازِ فکر اختیار کرنے سے نہیں ہوتی۔ کوئی ایسا فارمولا نہیں ہے جس کے اطلاق سے شعر بننے لگیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر پڑھا لکھا شخص کوشش کر کے شعر لکھنے پر قادر ہو جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی پی ایچ ڈی بھی شعر کہنا تو درکنار شعر کو صحیح طرح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ پھر شاعری کے بارے میں جدید اور قدیم کی لمٹ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ غالبؔ کو اس کے ہم عصر جدید شاعر کہتے تھے۔ کیا اب وہ قدیم ہو گیا ہے۔ شیکسپیئر اگر قدیم ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ جو مسرت اور عرفان اس کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ نئی انگریزی شاعری اس سے عاری ہے۔ اختر شیرانی اور مجاز اپنے نئے

انداز کی وجہ سے اپنے زمانے میں بڑے پاپولر تھے مگر آج انہیں کوئی نہیں پڑھتا۔ دیوانِ غالب اور دیوانِ حافظ آج بھی سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شعری مجموعے ہیں۔ شاعری جدید یا قدیم نہیں ہوتی۔ اچھی یا گھٹیا ہوتی ہے۔ بڑی یا چھوٹی ہو سکتی ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری وہی ہے جس کا طلسم زیادہ دیر تک قائم رہے۔ گھٹیا اور چھوٹی شاعری وقتی طور پر سنسنی تو پیدا کر سکتی ہے مگر ایک سنسنی خیز خبر کی طرح جلد ہی باسی ہو جاتی ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری وہی ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح حقیقت کبریٰ سے اور ازلی اور ابدی صداقتوں سے قائم ہو۔ شعر کو حسن کی تعریف ہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ شعر خود بھی ایک حسن پارہ ہو۔ شعر کا فن تخلیق حسن کا فن ہے اور جیسا کہ کیٹس نے کہا ہے حسن دائمی مسرت عطا کرتا ہے۔ بہر حال اچھا شعر ایک طلسمی کیفیت کا حامل ہوتا ہے جس کا مکمل تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔

س: ادبی آمریت کس طرح جنم لیتی ہے، کیا ہم ادبی آمریت کے دور سے تو نہیں گزر رہے؟

ج: ایک زمانہ تھا جب شاعر اور اس کے قاری یا سامع کے درمیان ذرائع ابلاغ حائل نہیں تھے۔ شعر اپنی خوبی کی بنا پر آگے چلتا تھا۔ بسا اوقات شعر آگے نکل جاتا تھا۔ شاعر پیچھے رہ جاتا تھا۔ کئی مشہور اور زبان زدِ عام شعر ایسے ہیں جن کے خالق کا پتہ نہیں۔ صرف اچھا شعر ہی لوگوں تک پہنچتا تھا مگر آج کل وہ شعر لوگوں تک پہنچتا ہے جسے ذرائع ابلاغ پہنچاتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی سوشل میڈیا اور ادبی رسائل جسے چاہتے ہیں مشہور کر دیتے ہیں۔ ان ذرائع ابلاغ نے یقیناً ایک طرح کی ادبی آمریت یا ادبی جبریت کی فضا پیدا کر دی ہے۔

س: ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام:

ج: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

یادیں

بہت ہی مدت کے بعد کل جب
کتابِ ماضی کو میں نے کھولا
بہت سے چہرے نظر میں اُترے
بہت سے ناموں پہ دل پسیجا
اک ایسا صفحہ بھی اس میں آیا
لکھا ہوا تھا جو آنسوؤں سے
کہ جس کا عنوان ''ہم سفر'' تھا
جو صفحہ سب سے ہی معتبر تھا
کچھ اور آنسو پھر اس پہ ٹپکے
پھر اس سے آگے میں پڑھ نہ پایا
کتابِ ماضی کو بند کر کے
تمہاری یادوں میں کھو گیا میں
اگر تو ملتا تو کیسا ہوتا
انہی خیالوں میں سو گیا میں

اگر تم لوٹ آؤ

بہاریں لوٹ آئیں گی
ہوائیں گنگنائیں گی
خوشی سے مست ہو ہو کر
گھٹائیں لڑکھڑائیں گی
نشے میں چاندنی ہوگی
فلک پر روشنی ہوگی
کچھ ایسی راتیں آئیں گی
کہ جھیلیں مسکرائیں گی
نظر میں پھول مہکیں گے
رنگیلے پنچھی آئیں گے
اُداسی لوٹ جائے گی
کچھ ایسے گیت گائیں گے
ستم کا دور ہوگا ختم، چاہت کا جنم ہوگا
نگاہوں میں خوشی ہوگی
نہ نم ہوگا، نہ غم ہوگا
نہ اب مجھ کو رُلائیں گی
خزائیں لوٹ جائیں گی
اگر تم لوٹ آؤ تو
بہاریں لوٹ آئیں گی

عامر بن علی/ جاپان

لبنیٰ صفدر/ لاہور

پات کو پھول کرنے والا ہے
ایک منظر نکھرنے والا ہے
اب مجھے تاب انتظار نہیں
ہجر موسم گزرنے والا ہے
یاد کیا کیا دلاؤں میں اُس کو
عہد سے جو مکرنے والا ہے
میری آواز سے وہ خوف زدہ
میرے ہونے سے ڈرنے والا ہے
میری سانسوں کو گروی رکھا تھا
اب وہ تاوان بھرنے والا ہے
ایسا لگتا ہے چاند آنگن میں
آسماں سے اُترنے والا ہے
ہاتھ اُس نے جو میرا تھام لیا
اب مقدر سنورنے والا ہے

کچھ بھی رعایت نہیں چاہیے
تمہاری محبت نہیں چاہیے
یہ کہہ کر مرے ہونٹ اس نے سیے
کہ شکوہ شکایت نہیں چاہیے
یہ جذبے ہیں مالِ تجارت نہیں
مجھے کوئی قیمت نہیں چاہیے
جو کہنا ہے، کھل کر زباں سے کہو
دلوں میں کدورت نہیں چاہیے
ہوں مجرم تو مجھ کو سزا بھی ملے
یہ جھوٹی حمایت نہیں چاہیے
تمہیں حق ہے، جیسا بھی چاہو، کرو
مجھے بھی اجازت نہیں چاہیے
تری آنکھ سے دور جانا نہیں
ترے دل سے ہجرت نہیں چاہیے

شاعری

کہاں ہے اب سخن ور میر جیسا
رکھے شعروں کو اکثر میر جیسا
ہماری آنکھ میں جادو نہیں ہے
کرے آنسو سمندر میر جیسا
ہماری عاشقی کی لاج رکھے
پڑے سر پر جو پتھر میر جیسا
غموں کی شدتیں ہوں میر والی
اُتاروں دن میں خنجر میر جیسا
روانی سے طبیعت میں ہماری
چلے شعروں کا لشکر میر جیسا
نہیں شاعر ہے کوئی اس طرح کا
لکھے دہلی کا منظر میر جیسا
سنو غالبؔ بڑے شاعر ہوئے ہو
کوئی ہو تم سے بہتر میر جیسا
سنے ہیں تم نے سب باہر کے شاعر
کوئی بیٹھا ہے اندر میر جیسا
ہمیں بھایا نہیں کوئی سخن ور
کوئی ہو سب سے بڑھ کر میر جیسا

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

دور سے بھی نہ وہ تجھے دیکھے
آئینے میں بھی تو جسے دیکھے
زندگی کے ہر ایک صفحے پر
تیری یادوں کے حاشیے دیکھے
طے کیا راستہ وفاؤں کا
اور آنکھوں میں آبلے دیکھے
اکثر اوقات اپنے ہونٹوں پر
اشک آلود قہقہے دیکھے
کھینچ دیں دوستی نے دیواریں
قربتوں میں بھی فاصلے دیکھے
جب کھلی چاندنی خیالوں کی
دن کو بھی ہم نے رتجگے دیکھے
فصلِ گُل میں بھی آرزو نہ کھلی
زخم پت جھڑ میں بھی ہرے دیکھے
پتھروں میں بھی جان ہے بسملؔ
کوئی ان کو تراش کے دیکھے

بسمل صابری/ساہیوال

میرے بس میں نگارِ زندگی ہے
مجھے اب اعتبارِ زندگی ہے
درِ دل پر کسی نے دی ہے دستک
مجھے تو انتظارِ زندگی ہے
پلا دی تھی نگاہوں سے کسی نے
ہمیں اب تک خمارِ زندگی ہے
سمٹ آئے وہ دل میں آس بن کر
یہ لمحہ یادگارِ زندگی ہے
وہاں تک ہم تمہارا ساتھ دیں گے
جہاں تک رہگذارِ زندگی ہے
لٹا کر قہقہے آنسو خریدیں
بس اتنا کاروبارِ زندگی ہے
ملا ہے جو ہمیں راہِ وفا میں
وہ غم پروردگارِ زندگی ہے
یہاں تو دفن ہیں لاکھوں اُمیدیں
یہ دل کیا ہے مزارِ زندگی ہے

تمہی بسمل نہیں صید حوادث
ہر اک انساں شکارِ زندگی ہے

بسمل صابری/ساہیوال

دھوپ سے جسم بچائے رکھنا کتنا مشکل ہے
خود کو سائے سائے رکھنا کتنا مشکل ہے
ظاہر میں جو رستہ سیدھا لگتا ہو اس پر
اپنے پیر جمائے رکھنا کتنا مشکل ہے
آوازوں کی بھیڑ میں اتنے بے میں
اپنی بھی اک رائے رکھنا کتنا مشکل ہے
ہم سے پوچھو ہم دل کو سمجھایا کرتے تھے
وحشی کو سمجھائے رکھنا کتنا مشکل ہے
صرف پرندے کو معلوم ہے تیز ہواؤں میں
اپنے پر پھیلائے رکھنا کتنا مشکل ہے
آج کی رات ہوائیں بے حد سرکش لگتی ہیں
آج چراغ جلائے رکھنا کتنا مشکل ہے
دوستیوں اور دشمنیوں کی زد میں رہ کے نسیمؔ
اپنا آپ بچائے رکھنا کتنا مشکل ہے

نسیم سحرؔ/اسلام آباد

سامنے آنکھوں کے رقصاں تھا تماشا دوسرا
ور منظر میں نے دنیا کو دکھایا دوسرا
لمحۂ فرصت ملے تو غور کرنا چاہیے
بام و در کس کے چمن میں کون آیا دوسرا
رقص آسیب فنا جاری یہاں جب سے ہوا
ڈھونڈتی ہیں اب ہوائیں بھی ٹھکانہ دوسرا
خود شناسی کے مراحل طے نہ ہو پائے اگر
میں بھی ہو جاؤں گا شاید رفتہ رفتہ دوسرا

اب خوشی سے ہم چلیں اس پر کہ جبری طور پر
سامنے اپنے رہا کب کوئی رستہ دوسرا
اک پیالے میں تھا امرت دوسرے میں زہر تھا
سوچ کر میں نے اٹھایا ہے پیالہ دوسرا
میں کہ پھولوں کی زباں میں بات کرتا تھا نسیم
شہر کے حالات نے بخشا ہے لہجہ دوسرا

نسیم سحر/اسلام آباد

اب کے عجب سفر پہ نکلنا پڑا مجھے
راہیں کسی کے نام تھیں چلنا پڑا مجھے
تاریک شب نے سارے ستارے بجھا دیے
میں [illegible] کا چراغ تھا جلنا پڑا مجھے
یارانِ دشت رونق بازار بن گئے
سنسان راستوں پہ نکلنا پڑا مجھے
ہر اہل انجمن کی ضرورت تھی روشنی
میں شمع انجمن تھا پگھلنا پڑا مجھے
ظالم بہت ہے شدت احساس آگہی
اکثر پرائی آگ میں جلنا پڑا مجھے
راہوں کے پیچ وخم میں بلا کے طلسم تھے
چلنا بڑا محال تھا چلنا پڑا مجھے
آساں نہیں تھا ظلمت شب سے مقابلہ
سر پر جلا کے آگ پگھلنا پڑا مجھے

سید تابش الوری/بہاولپور

جس نے نہ بھول کر عنایت کی
جانے کیوں اس سے پھر شکایت کی
سب خساروں کے کام کرتے ہو
تم کو فرصت نہیں محبت کی
بے دھڑک میرے دل میں آ جاؤ
کیا ضرورت تمہیں اجازت کی
جب سے ٹوٹا ہے دوستی کا بھرم
اب تمنا نہیں رفاقت کی
خوار و رسوا ہوئی یزیدی ہوس
عشق نے نیزے پر تلاوت کی
کیا کہوں میں بچھڑنے کا منظر
وہ گھڑی تھی عجب قیامت کی
دل دیا ہے نیا نکور تمہیں
ہم نے اس میں نہیں خیانت کی
مجھ کو مصروف رکھتی ہے فرصت
بات کیا کیجیے فراغت کی
میرا دامن حضورؐ خالی ہے
آس ہے آپؐ کی شفاعت کی
جو ہیں مجرم وہی ہیں اب منصف
بات کیا کیجیے عدالت کی
مل گئی جب جلیلؔ وہ چوکھٹ
ہم نے جی بھر کے پھر عبادت کی

احمد جلیل/اوکاڑہ

مستقل درد کی روانی ہے
جیسے نیزے پہ زندگانی ہے
جلتے رہتے ہیں خواب آنکھوں میں
ہاتھ میں آگ ہے نہ پانی ہے
دشتِ احساس میں برہنہ پا
ہم نے یہ خاک بھی تو چھانی ہے
کیا یہ گزری تھی کم نصیبوں پر
ترے ہاتھوں میں جو کہانی ہے
رُک گئے آنکھ کے دریچے میں
بادلوں کی یہ مہربانی ہے
اس کنارے سے اُس کنارے تک
چل پڑیں گے یہ اب کے ٹھانی ہے
جیت جاتے زمانے بھر سے ہم
تری خاطر یہ ہا مانی ہے
وقت پھیلا ہوا رگِ جاں میں
خاک میں ڈولتی روانی ہے

آسناتھ کنول/لاہور

ہو گئی شام تو نکلا مرا دن
کیسے ہوتا ترو تازہ مرا دن
رنگ بکھریں نہ تری یادوں کے
ہونے لگ جاتا ہے پھیکا مرا دن
ہاتھ سے نکلی شعاعِ اُمید
دیکھتے دیکھتے بکھرا مرا دن
بھاگتی دوڑتی آوازوں میں
جاگتے جاگتے سویا مرا دن
اک سفر ہو گیا ہے اور ظہورؔ
چاند اُبھرنے لگا، ڈوبا مرا دن

ظہور چوہان/بہاولپور

میں اپنی ذات میں سمٹا ہوا ہوں
سمندر تھا مگر قطرہ [illegible] ہوں
کہاں تک مجھ کو کاٹو گے بھلا تم
زمیں میں دور تک پھیلا ہوا ہوں
گلہ شکوہ نہیں مجھ کو کسی سے
میں اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہوں
بظاہر تو لبوں پر ہے ہنسی بھی
مگر اندر سے میں ٹوٹا ہوا ہوں
تری یادوں کے سائے سے لپٹ کر
میں اپنے آپ کو بھولا ہوا ہوں
تجھے کھو کر ہوا محسوس مجھ کو
نہ تیرا اور نہ میں اپنا ہوا ہوں

مجھے مرنا بھی ہے خالدؔ کسی دن
میں دنیا میں اگر پیدا ہوا ہوں
پروفیسر محمد خالد کھوکھر/رحیم یار خاں

کچھ چراغوں کی میزبانی ہے
اور باطن میں نوحہ خوانی ہے
ہر کسی پر بہا نہیں سکتا
اشک ہے اور خاندانی ہے
کس جزیرے پہ آ گیا ہوں میں
سانس لینا جہاں گرانی ہے
آئے مجھ سے دعائیں لے جائے
جس نے دل کی مراد پانی ہے
کارِ دنیا میں غرق مت ہونا
یہ کہانی ہے اور فانی ہے
روشنی کا میں دل دکھا نہ سکا
سب چراغوں کی بات مانی ہے
یہ زمیں پر جو حسن دکھتا ہے
ہم فقیروں کی مہربانی ہے
میں برا ہو نہیں سکا جامیؔ
کس قدر بانجھ زندگانی ہے
مستحسن جامی/خوشاب

خوشبو ہے اگر یار تو خوشبو پہ فدا میں
وہ حسن چراغوں کا، چراغوں کی ضیا میں
کرتا ہوں سفر گزرے زمانوں کا شب و روز
رہتا نہیں اک لمحہ بزرگوں سے جدا میں
دنیا کے جزیروں میں ترا بھید نہ پایا
حالانکہ خلاؤں میں بھی ہر سمت گیا میں
شاید کوئی زرخیز بھنور یاد کا اُبھرا
کل رات کسی آنکھ سے بہتا ہی رہا میں

مارے ہیں غمِ زیست نے پُردرد طمانچے
لیکن کسی منزل پہ نہیں تھک کے گرا میں
حیرت کی نگاہوں سے سبھی دیکھ رہے تھے
جب کوچۂ جاناں میں گیا بن کے گدا میں
جامیؔ میری گفتار کسی پر نہ کھلی تھی
سب لوگ پرانے تھے فقط ایک نیا میں
مستحسن جامی/خوشاب

نئی سڑک سے جو پہلے گلی ملے گی تمہیں
وہاں کی بیل سے گرتی کلی ملے گی تمہیں
میں جانتا ہوں یہاں سے کوئی نہ گزرے گا
مرے مکان کی کھڑکی کھلی ملے گی تمہیں
ہماری صبح تمہیں دیکھنے سے ہوتی تھی
ہماری شام مگر اب ڈھلی ملے گی تمہیں
مری لحد کا پتا اس لیے بھی آساں ہے
کہ میرے نام کی تختی جلی ملے گی تمہیں
میں چکھ چکا ہوں محبت کا ذائقہ پہلے
کہ میرے دل کی روانی چلی ملے گی تمہیں
تو بے وفائی کی تہمت لگا رہا ہے کیوں
ہمارے چہرے پہ کالک ملی ملے گی تمہیں
حسنین پرویز

بھیڑ تھی حدِ نظر تک کتنا اُونچا شور تھا
خامشی بھی چونک اُٹھی اچھا خاصا شور تھا
مجھ کو ایسا لگ رہا تھا بے حسی کے دور ہیں
لوگ سارے مر گئے تھے اور زندہ شور تھا
ایسا پہلی بار ہے یہ دونوں یکجا ہو گئے
جتنی پیاری خامشی تھی اتنا پیارا شور تھا
کیا بتاؤں میں تمہیں ان جادوئی لمحات میں
دیکھتے ہی تم کو دل میں میرے کیسا شور تھا

خامشی نے کان میرے بھر دیے تھے اس قدر
کوئی چپ ہو جائے تو بھی مجھ کو لگتا شور تھا
آگہی و علم کا فن یوں اکٹھا تھا میاں
لوگ تھے جتنے زیادہ اتنا تھوڑا شور تھا
حسنین پرویز

خانۂ دل کیے ویران کہاں جاتا ہے
یہ تری یاد کا سامان کہاں جاتا ہے
حیرتی ہوں کہ [illegible] اک گلی دیکھنے
شہرِ دل میں مچا طوفان کہاں جاتا ہے
زرد پھولوں میں گلِ سرخ کا منظر کوئی
کیا بتاؤں کہ مرا دھیان کہاں جاتا ہے
شام سے پہلے ہوا آنکھ سے اوجھل سورج
کوئی دیکھے کہ یہ نادان کہاں جاتا ہے
تیری خاطر میں سبھی کارِ جہاں چھوڑ آیا
یوں ملاقات کے دوران کہاں جاتا ہے؟
اپنی وحشت مری آنکھوں کے حوالے کر کے
اتنی عجلت میں بیابان کہاں جاتا ہے؟
سوچتا ہوں کہ گزرگاہِ زمانہ سے علی
آدمی آدمی ہلکان کہاں جاتا ہے
مہر علی/ساہیوال

شہر کی بے چراغی مٹانی پڑی
آگ اپنے ہی گھر کو لگانی پڑی
صرف تجھ کو منانے کی خاطر مجھے
پھول سے ایک تتلی اُڑانی پڑی
رات بھر چاند دیکھا سرِ آسماں
پھر بھی تصویر تیری بنانی پڑی
تیری دنیا سے باہر نکلنے کے بعد
اک نئی دنیا مجھ کو بنانی پڑی

مدتوں بعد جب گھر سے نکلا تھا میں
شام ناراض تھی سو منانی پڑی

مہر علی/ساہیوال

اے ہوا! اس کے کبھی شہر سے گزر تو

اے ہوا!
اس کے کبھی شہر سے گزر تو
چپکے سے کہیں اس کے
کسی خواب کے ساحل پر
اس دل کی تڑپ اک
تصویر بنا آنا
دھیرے سے کہیں اس کے
دل کے آنگن میں
تم میری محبت کی
اک بیل اُگا آنا
اے ہوا! اس کے
کبھی شہر سے گزر تو
چپکے سے کہیں اس کے
لمس کے جادو کی
اک مے چرا لانا
ان جاگتی آنکھوں کو
میری جاگتی راتوں کا
کوئی عکس دکھا آنا
یہ سب جو نہیں ممکن
تو اے ہوا! اس کے
کبھی شہر سے گزر تو
بس اتنا کہہ دینا
دن بھر کی تپش جب اک
شام کو ڈھونڈے تو
جب شام کی پرچھائیں
کسی چاند کو ڈھونڈے تو
جب چاند کی تنہائی
بے کل سی گھومے تو
اس وقت مجھے پھر تم
کبھی یاد نہیں آنا

شکیلہ سحر/فیصل آباد

کتابِ زیست سے سوکھے ہوئے گلاب لیے
پلٹ رہا ہوں مشقت کی آب و تاب لیے
میں چل پڑا ہوں اُداسی کے روبرو چپ چاپ
جوان لاشوں کی صورت ادھورے خواب لیے
خیال و خواب کے جگنو چمک پڑے ہیں ابھی
دیارِ یار سے آیا ہوں آفتاب لیے
ملال دل سے مٹانے کی جستجو لے کر
تمہاری بزم میں آئے ہیں ہم گلاب لیے
چہار سمت سے لوٹا ہے قافلہ دل کا
وہی ملال کی شورش وہی عذاب لیے
اسد دکھاؤ ہماری طرح کوئی پاگل
سراب رستوں پہ چلتا ہو ماہتاب لیے

رفیع اسد/تلمبہ

یہ جو اپنے زوال کا دکھ ہے
دکھ تو یہ بھی کمال کا دکھ ہے
پوچھتے ہو جواب کا مجھ سے
یارو مجھ کو سوال کا دکھ ہے
چاند سے بڑھ کے ہے حسیں وہ تو
چاند جیسی مثال کا دکھ ہے
مچھلیاں پھینک دی ہیں دریا میں
اب مجھے خالی جال کا دکھ ہے
ساتھ میرا دیا نہیں اُس نے
مجھ کو اپنی دھمال کا دکھ ہے
ہجر کا دکھ پیام ہے سب کو
اور مجھ کو وصال کا دکھ ہے

اقبال پیام/لاہور

Alike

تم صبح کی کرنوں جیسی ہو
میں شام کے تارے جیسا ہوں
تم نیلی جھیلوں جیسی ہو
میں سبز کنارے جیسا ہوں
تم اُٹھتی لہروں جیسی ہو
میں گرتے دھارے جیسا ہوں
تم برف کے گالوں جیسی ہو
میں اک شرارے جیسا ہوں
تم پھر بھی میرے جیسی ہو
میں پھر بھی تمہارے جیسا ہوں

حسن عباسی/لاہور

سورج کبھی تو میرے نشانے پہ آئے گا
پھر چاند کا دماغ ٹھکانے پہ آئے گا
میں مانتا ہوں کوئی نہیں اس جیسا خوش مزاج
میں جانتا ہوں جب وہ رُلانے پہ آئے گا

حسن عباسی/لاہور

انشائیہ

دودھ کی نہر ہے خرافاتی
چائے کی نہر کھودتا فرہاد

کسی ارسطو سے سن لیا کہ چائے اور دودھ دونوں کی افادیت ان کو تنہا پینے میں ہے۔۔۔ اب یا چائے چھوڑیں گے یا ارسطو۔۔۔۔

جب سے انگریز نے ہمارے آباواجداد کو چائے کی پتی والا نشہ لگایا۔ ہمارے بڑوں نے انگریز کی غلامی سے انکار کا یہ طریقہ ایجاد کیا کہ پیتے ضرور تھے لیکن دودھ میں پتی اور گڑ ڈال کر۔ اس مشروب پر اکثر بالائی کی تہہ بھی جمائی جاتی تاکہ حقیقی آزادی کا مکمل اظہار ممکن ہو بلکہ مزا لیا جاسکتا۔

وقت بدلا۔۔۔ طور بدلے۔۔۔ ہمارے ابا اماں کے وقت تک دودھ میں بالائی کا رواج ضرور رہا لیکن انہوں نے ادھیڑ عمری کو چھوتے ہی سادہ چائے پر اکتفا کیا اور ابو کیونکہ غالب کی طرح انگریز کے بنائے سسٹم وقوانین کے معترف ہیں وہ گورے سے اظہار یک جہتی کے لئے کالی کافی بھی پیتے ہیں۔

بہر حال ہمیں تو بارہویں جماعت تک اماں نے کبھی چائے یا کافی پینے دی نہ ہی ان سے انس پیدا ہونے دیا۔ روز رات کو گرم دودھ پی کر سوتے اور سمجھتے اسی دودھ کے گرم گلاس سے رنگ گورا ہوگا، سبق یاد ہوگا، امتحان میں اول آئیں گے، دل و دماغ صراط مستقیم پر رہیں گے، ہڈی مضبوط ہوگی اور دشمن کمزور۔۔۔

بارہویں جماعت میں مطلوبہ نتائج نہ لانے پر پاکستان کے تعلیمی سسٹم اور دودھ کی افادیت دونوں پر سے ایمان اٹھ گیا۔ ہم نے بچپن کی indoctrination کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور رات کو دودھ میں چھپ کر آدھا چمچ پتی ڈالنے لگے۔

انہی دنوں ایک ہم جماعت لڑکی نے بتایا کہ بھینس کا دودھ انسان کو ڈفر بنا دیتا ہے۔۔۔ ہمیں یک دم اپنی ساری ناکامیوں کی وجہ سمجھ آگئی۔۔۔

یونیورسٹی میں داخلہ ہوا تو دیکھا کہ ہماری جماعت و کمرے کے ساتھی لڑکیاں سارا دن چائے ہ بھرا کپ ہاتھ میں لے کر گھومتیں۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار لوٹے اور بالٹی کے سائز کا چائے کا کپ دیکھا۔ بس جیسے لڑکے ایک دوجے کو سیگرٹ کی لت لگاتے ہیں۔۔۔ ویسے ہی۔۔۔

ہمیں بھی پہلے ایک بالٹی نما کپ تحفے میں ملا۔۔ اس کپ میں چند ایک دن مختلف جگہوں سے فری چائے بھی انڈیلی گئی، بعد میں چائے ادھار ملنے لگی، کب تک بچا کی طرح قرض کی مے پیتے، بالآخر ہم اپنی پتی، خشک دودھ اور چینی کا ڈبہ خرید لائے۔ پھر کیا تھا۔۔ دو مہینے چائے کی مختلف اقسام پر ریسرچ ہوتی رہی اور طے یہ ہوا کہ ہائی وے پر بنے ڈھابے والے کی چائے کی طرح دودھ پتی کڑھا کے یک جان کر کے ڈبل میٹھے کے ساتھ جو چائے وجود میں آتی ہے وہی اول درجے کی چائے ہے۔

سارا سارا دن چائے کی افادیت پر بات ہوتی، اور ہمیں بتایا جاتا کہ ہاسٹل میں مقیم فلاں لڑکی دن میں 10 کپ چائے پیتی تھی اس بار اسی کی اول پوزیشن آئی۔ ہم خوش ہوئے کہ اب دوائے دماغ ہاتھ آئی ہے، چائے ہمارے اندھیر ذہن کی بتی روشن کرے گی۔ کیمسٹری کے جو فارمولہ دماغ سے سلپ ہونے لگیں گے جھٹ سے ان کو پکڑ کر دماغ کے ڈبے میں ڈال کر تالا لگا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلے گی۔ کرشماتی مشروب کہا کرتے تھے ہم اسے۔

اگرچہ ہم فارمیسی کی ڈگری کر رہے تھے لیکن بغیر تحقیق کے، سنی سنائی حکمت کی باتوں، تھرڈ کلاس ٹوٹکوں اور افواہوں پر یقین کرنا بہت اچھا لگتا تھا جیسے کہ اکثریت کو لگتا ہے۔

شعور کی اگلی منزل پر خشک دودھ کی چائے پینے لگے کہ یہی فیشن تھا۔۔۔ چائے کا ڑھنے والے کام پر سب ہمارا مذاق بناتے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ دوست ہمارے پیشہ آبا پر شک کریں جو کہ واقعی کم از کم دو پشت تو سپہ گری رہا۔

پھر کسی نے کہا کہ یہ خشک دودھ نہیں زہر ہے۔ اس کے ذرات خون میں پھرتے رہیں گے، حل نہیں ہوگے اور اندر سے شریانوں کی سفیدی کردیں گے۔ یعنی دل کی شریان وغیرہ بلاک ہو جائے گی۔۔۔ ہم نے بغیر تحقیق یقین کرنا مناسب سمجھا اور فوراً ڈبے کے دودھ والی چائے شروع کی۔

اکثر خیال آتا کہ بالائی کے بغیر اتنا گاڑھا دودھ؟

ظالم نے کچھ ملا نہ دیا ہو "شراب" میں۔

جب سرکاری نوکری لگ گئی، سوچا کہ اب تو ڈفر ہونے سے نقصان نہیں الٹا فائدہ ہوگا چنانچہ ایک عرصہ بھینس کے دودھ کی چائے کا مزہ لیا۔۔۔ اور افسران سے شاباش بھی۔

ہماری زندگی میں ارسطوؤں کی کمی نہیں۔۔ ہمیں بھینس کے بجائے گائے کے دودھ کے استعمال کا مشورہ دیا گیا کہ ہلکا، زود ہضم اور صحت بخش ہوتا ہے۔ ان دنوں ہم مہابھارت کا ترجمہ پڑھ رہے تھے۔ سوچا 5 ہزار سالہ تہذیب نے بھینس کو کبھی عزت نہ دی لیکن گائے کے سر پر پوری دنیا ٹکا دی۔ کچھ فائدہ ضرور ہے اس کے دودھ میں۔

سو ایک عدد گائے ہی خرید ڈالی اور لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے چھپا کر رکھنے میں کامیاب بھی رہے۔۔۔ دو سال اس کے دودھ کی چائے پی۔ ہمارا نہ کچھ بھلا ہوا نہ برا۔ البتہ اس کے بچھڑے جس پر سب کو صدمہ ہوا، وہ بیمار ہوگئی اور ہمارا دل اچاٹ ہوگیا۔

پھر دودھ کے نام پر جو ہاتھ لگا چائے میں شامل کیا۔۔۔ سوائے ناریل کے دودھ کے۔

چند سال پہلے انکشاف ہوا کہ چائے تو دودھ کے بغیر پی جانی چاہئے۔۔۔ یعنی نئی ترکیب کے مطابق دودھ الگ، پانی الگ اور چائے الگ۔۔۔

ہم اس پر کسی قسم کی سائنسی تحقیق کے موڈ میں نہیں۔ مبادا یہ بات سچ ہی ثابت نہ ہو جائے۔

اس کی رد میں دلیل تو یہ بھی ہے کہ پیٹ میں جا کر مل جائے گی۔ دنیا میں ان تین کو جدا رکھنا سوائے ظلم کے اور کیا ہے؟

بہر حال دن میں ایک وقت ان تینوں کو الگ پی کر بھی دیکھ رہے ہیں کہ یہ نئی ترکیب زندگی میں کیا انقلاب برپا کرتی ہے۔۔۔

اگر پھر بھی انقلاب نہ آیا تو کیا کرنا چاہیے؟

مشورہ دیں

غرارہ کہانی:

تصویر میں پہنا غرارہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ بقول امی، پچھلے دور میں لڑکیوں کے جہیز ان کے جوان ہونے سے پہلے ہی بننا شروع ہو جاتے تھے۔ یہ غرارہ 46 سال قبل لاہور سے روپیہ 3800 کے عوض امی کے جہیز میں رکھنے کی نیت سے خریدا گیا۔

یہ فرشی غرارہ اتنا بھاری ہے کہ اس کو دوپٹے سمیت پہن کر چلنا دھان پان عورت کے لئے تو واقعی مشکل ہے۔ ہم جیسی صحت ہو تو گزارا ہو سکتا ہے۔ غرارہ ہمیشہ سے ہماری fantasy cultural کا حصہ رہا تبھی شادی بیاہوں پر اسی غرارے کے بھائی بہن یعنی شرارے، لہنگے وغیرہ پہنے جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے کارفرما ایک معاشرتی نفسیات ہے کہ شادی والے دن دلہن خود کو شاہ زادی وغیرہ ہی سمجھتی ہے۔

تحقیق پر معلوم ہوا کہ بہت سی دیگر اشیاء کی طرح یہ بھی اودھ کے نوابوں کی ایجاد ہے یا اختراع کہیں۔۔۔

عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب "گذشتہ لکھنؤ" میں لکھا ہے کہ نواب ناصر الدین حیدر کو برطانوی لباس بہت پسند تھا۔ اس وقت تک اودھ میں مرد و عورت کے دیگر لباس کے علاوہ ایک پہناوا بہت مشہور تھا

وہ تھا۔۔"پائے جامہ"

پائے: ٹانگیں

جامہ: کپڑا

نواب صاحب نے ایک برطانوی خاتون کو لمبا کلاسیکی گاؤن زیب تن کئے دیکھا تو مچل گئے۔ (اللہ جانے خاتون سے گاؤن مانگا یا شاہی درزی کو حکم دیا کہ اسی گاؤن جیسا کچھ سی ڈالو) خیر جیسے بھی گاؤن حاصل کیا وہ اپنے حرم (جو خواتین کا جم غفیر ہوتا تھا) کو دے دیا گیا۔ تاریخ اور سلیم الرحمان دونوں خاموش ہیں لیکن ہمارا گمان ہے کہ شاہی خیاط یا خیاطہ کے حوالے کیا ہوگا اس شاہی حکم کے ساتھ کہ گاؤن بھی رہے اور پاجامہ بھی یا حرم میں شامل کسی تخلیقی ذہن رکھنے والی لونڈی یا بیگم نے مغرب و مشرق کو ایسے ضم کیا ہوگا کہ غرارہ وجود میں آ گیا۔

مذاق برطرف ایک خاتون نے اپنے بلاگ میں لکھا ہے کہ غرارے میں گھٹنوں سے اوپر pleats اسی انگریزی گاؤن سے متاثر ہیں ورنہ بظاہر ان کے بغیر بھی غرارہ سیا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے اوپر کا حصہ الگ۔۔ نیچے کا الگ۔۔

یہ سٹائل قدیم ہندوستانی عورت کے لباس سے لیا گیا جیسے ساڑھی، شرارہ، شلوار قمیض، گھاگرا چولی، کرتی لاچہ وغیرہ

اب چونکہ اودھ کی بیگمات میں یہ fashion / fad کی شکل اختیار کر گیا تھا بہت عرصے تک یہ صرف بیگمات کا لباس رہا۔۔۔۔

ہاری، کمی، کام والیاں، غریب بے چاروں کے پاس نہ اتنا کپڑا تھا، نہ اجازت، نہ ہی یہ لباس پہن کر جسمانی محنت مشقت ممکن تھی۔

کہ اودھ کے نوابین اور بیگمات نے اس کو زردوزی، زربفت اور ریشم جیسے بیش قیمت کپڑے میں بنوا کر مڈل کلاس سے بھی دور رکھا۔ سلطنت کا دائرہ کار محدود ہونے سے جیسے شاہی حکیموں کے نسخے، شاہی باورچیوں کی receipies عام ہوئیں۔ غرارہ بھی عام ہوا۔۔ یہ لباس آہستہ آہستہ مسلمان عورتوں کے پہناوے کے طور پر مشہور ہوتا گیا اور مسلم ریاستوں، اتر پردیش، بھوپال، حیدرآباد دکن، دہلی کے ہر مسلم گھر کا لازم حصہ بن گیا

گھروں میں براکیڈ اور کاٹن کے غرارے چلتے۔

فرشی غرارہ مجھے ہمیشہ ناسٹیلجیا دیتا ہے۔ مجھے اسے پہن کر اپنی نانی اماں یاد آتی ہیں۔ ان کی غراروں میں تصاویر نظر کے سامنے پھرتی ہیں۔ یہ غرارہ اور اس جیسے کئی امی سے ہتھیا لئے ہیں۔۔۔ اگر یہ غضب کا کپڑا اگر اگلی ایک آدھ دہائی بھی اسی طرح چمکتا دمکتا رہا تو اگلی نسل کو یہ نشانی دے کر جائیں گے۔

(اگرچہ تصویر میں غرارہ کے لوازمات پورے نہیں۔ ماتھا پٹی، جھومر، نیکہ، سہارے، نتھ۔۔۔ اس لباس کو مکمل کرتے ہیں)

مہا شاعر ظفر اقبال صاحب کی حمایت میں

ابرار ندیم/ لاہور

اللہ معاف کرے کیا زمانہ آ گیا ہے لوگوں میں بڑوں کا ادب و احترام اور شرم و حیا نام کی بھی نہیں رہی۔ یہ بات ہمیں یوں یاد آئی کہ پچھلے دنوں ہم سب کے پسندیدہ مقبول عام اور صاحب طرز شاعر ظفر اقبال صاحب نے لاکھوں دلوں کی دھڑکن بھارتی فلم سٹار کترینہ کے لئے ایک چھوٹا سا منظوم اظہارِ محبت کیا لکھا کہ اس کے جواب میں ظفر صاحب کی عمر، مرتبے اور جذبات کا لحاظ کیے بغیر سبھی ''ہیر کے مامے'' سوشل میڈیا پر اپنی اپنی لٹھ لے کر کسی لحاظ کے بغیر ان کے دوالے ہو گئے ہیں۔ گویا ظفر صاحب سے ان کی جمنوں کی رقابت ہو اور وجہ رقابت بھی کوئی اور نہیں یہی کترینہ ہے۔

ظفر صاحب کے رقیب روسیاہوں کے اُن پر اب تک کے دھواں دھار ردعمل سے یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے ظفر صاحب نے کترینہ کے لئے ''ہدیہ عقیدت'' لکھ کر تحریک انصاف کے جناح ہاؤس اور ریڈیو پاکستان پشاور پر حملے سے بھی زیادہ کوئی قابلِ مذمت یا مکروہ کام کر دیا ہے۔ حالانکہ میرے ناقص علم کے مطابق ظفر اقبال صاحب کا اب تک کا سابقہ ریکارڈ گواہ ہے کہ اُن کے اس عمل کے پیچھے غلط ذہن والے لڑکوں والی روایتی اور مطلبی محبت کے علاوہ دیگر پاک صاف محرکات بھی ممکنہ طور پر ہو سکتے ہیں۔ یوں بھی ظفر اقبال صاحب ایک سینئر ادیب اور منجھے ہوئے شاعر ہونے کے ساتھ خاص طور پر اپنے ہر دلعزیز ٹی وی اینکر آفتاب اقبال کے ابا جی بھی ہیں۔ اب اس مرتبے اور اس عمر میں اُن سے کسی ہلکے پن کی توقع کرنا یقیناً سراسر زیادتی ہو گی۔ محض اس کلام کی بنیاد پر اُن کے بارے میں جلد بازی یا جلن بازی سے کوئی بھی غلط رائے قائم کرنے کی بجائے ہم سب کو حسن ظن سے کام لینا چاہیے۔ کترینہ عمر میں ان کی پوتیوں یا نواسیوں کے برابر ہے تو اس بات کو اس طرح کیوں نہ لیا جائے کہ ظفر اقبال صاحب ایک شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ مشرقی روایات و اقدار کے حامل ایک ایسے بزرگ بھی ہیں جو دوسروں کی بہو بیٹیوں کو بھی اپنی بیٹیوں کی طرح ہی سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک یہ ایک دادے یا نانا ابو کا اپنی پوتی اور نواسی کے لئے اظہار شفقت یا پیار ہے جس پر سارا شور و غوغا صرف وہ لوگ کر رہے ہیں جو در پردہ خود کترینہ کی یک طرفہ محبت میں غرق ہیں اور ظفر اقبال صاحب کے لئے اُن کا جارحانہ ردعمل محض اُن کی رقیبانہ جلن ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے جس سے احباب اور ظفر اقبال صاحب کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ویسے اپنے اپنے ساڑ نکالنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ براہ راست ظفر اقبال صاحب سے ہی پوچھ لیا جائے کہ وہ کترینہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر ظفر اقبال صاحب اپنے اس عشق کے نتیجے میں ہونے والی بدنامی اور ظالم سماج سے ڈرے بغیر ڈنکے کی چوٹ پر کترینہ سے اپنی یکطرفہ محبت کا جرم قبول کر لیتے ہیں تو پھر وہ جانیں اور اُن کے بچے۔ پھر بھی ہمارے سمیت کترینہ کے کسی بھی ڈرپوک عاشق کا اس معاملے میں کچھ بھی کہنا سننا نہیں بنتا ہے۔ اس لئے کہ عشق محبت کرنا بزدلوں کا نہیں دلیروں کا کام ہے۔ یوں بھی اگر ظفر صاحب کسی لگی لپٹی کے بغیر کترینہ سے اپنی ''مرزا صاحباں'' والی محبت کا کھلم کھلا اقرار کر لیتے ہیں تو پھر یہ لڑکی اور لڑکے دونوں کا آپس کا معاملہ ہو گا۔ کیا پتا جب کترینہ تک ظفر اقبال صاحب کی سچی محبت کے جذبات پہنچیں تو وہ سلمان خان کو چھوڑنے کے بعد ظفر اقبال صاحب کے لئے اپنے مجازی خدا وکی کوشل سے بھی طلاق کا مطالبہ کر دے۔

لیاقت علی منہاس/ میاں چنوں

رہِ عشق میں دربدر ہو گیا ہے
سنو گے کبھی تم امر ہو گیا ہے

محبت کے نامے نہ آنے کا شکوہ
بجا ہے کہ گم نامہ بر ہو گیا ہے

ہیں وہ بے مروت جسے چاہتے ہیں
مگر اپنا پھر بھی اثر ہو گیا ہے

بلندی پہ تھا عشق کی محوِ پرواز
وہ نفرت میں بے بال و پر ہو گیا ہے

بہار آئے گی جانے کب، دشت میں اب
شجر آس کا بے ثمر ہو گیا ہے

لیاقت اُسے لاکھ سمجھایا گیا
وہ خودسر تھا اب بے خبر ہو گیا ہے

شبابِ ثاقب

فخرزمان فخر

آج میں علی پور چٹھہ کی کہکشاں کے ادبی ستاروں میں سے ایک ایسے ستارے کا تعارف پیش کرنے جارہا ہوں جو اپنا تعارف آپ نہیں ہے۔ بظاہر تو وہ ایک شاعر ہیں لیکن اگر ذرا تگ ودو کرکے کچھ معلوماتِ مخفیہ تک رسائی حاصل کی جائے تو بہت سے اسرار ان کی شخصیت کے حوالے سے کھل کر ہمارے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔

5 فٹ 40 انچ قد کے ساتھ چالیس سالہ نوجوان نما یہ شخص پُروقار شخصیت کا حامل ہے۔ پہلی ملاقات میں اس سے ملنے پر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے معمر رانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ تاہم ذرا دیر کی تاخیر سے اس کے اندر کا کھلاڑی بھی نکل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔۔اور اگر چند قدم اور ساتھ چلا جائے (بھاگنے کی تو ضرورت ہی نہیں) تو معلوم ہوتا ہے کہ جناب نامی گرامی اور سرگرم صحافی بھی ہیں۔ سرگرم کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے سر پر ہاتھ سینکنا شروع کردئے جائیں۔

دلکش چہرہ، بوکلین شیو ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ چمک دمک دکھاتا ہے۔ اس چمک دمک میں آفٹر شیو لوشن کا زیادہ رول ہے۔ سر پر چوٹی کی طرف بالوں کا ایک جزیرہ ہے۔ پچھلی جانب گدی کے گرد بالوں کا ایک سلسلہ حصار باندھے دائیں کان سے لے کر بائیں کان تک مسلسل چلتا چلا جاتا ہے۔ اگر آپ چھت پر بیٹھے ہوں اور موصوف نیچے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں تو دیکھنے پر بالوں کا یہ سلسلہ ایک چاند کی سی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اور عین چوٹی میں واقع بالوں کا وہ جزیرہ کسی جھلملاتے ہوئے تارے کی مانند نظر آتا ہے۔ گویا ایسا گمان ہوتا ہے جیسے چاند اپنی تارا کو گود میں لئے بیٹھا میٹھی میٹھی باتیں کررہا ہو۔ چاند تاروں جیسا سر لئے یہ شخص محفل میں چار تو نہیں البتہ ایک چاند اور ایک تارے کا اضافہ ضرور کردیتا ہے۔ بلکہ لگتا ہے کہ کہکشاں سامنے ہے۔

کشادہ، روشن اور چمکدار پیشانی خوش نصیبی وخود فریبی کی علامت نظر آتی ہے۔ بات کرتے کرتے جب موصوف ذرا بھنوئیں اچکاتے ہیں تو پیشانی پر دو دو تین تین بل اس صورت میں پڑ جاتے ہیں جیسے سوکھی ندی کی دو لہریں باہم ملتی اور حرکت کرتی ہیں۔ اگر ان میں سیلاب آجائے تو بھی چھلکتی نہیں ہیں، کیا عالیٰ ظرفی ہے۔

چھوٹی، چمکدار اور قدرے بھوری آنکھوں کی حفاظت کے واسطے چند بھورے بالوں کا ایک ایک مسلح دستہ ماتھے کیذرا نیچے دونوں آنکھوں کے اوپری سروں پر پہرہ فگن ہے۔ موصوف جب بات کرتے ہیں تو یہ بھنوئیں خود بخود اوپر نیچے حرکت کرکے جملے کا مطلب زبان کی نسبت زیادہ واضح طور پر سامعین کو سمجھا دیتے ہیں۔ ہر دو نینوں کے درمیان ایک عدد ناک ہے جو چہرے سے ذرا پہلے ہی مطلوبہ جگہ پہنچ جاتی ہے۔ بعض دفعہ منہ کے حصے کی چیز بھی اسی ناک کے لمس سے ہم کنار ہوئے بنا نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ یہاں ناک کی سرحد ختم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ یہ ناک وہ ناک ہے جس کو سب خطرناک کہتے ہیں۔ اس لئے ایک دردناک بات بارہا دیکھنے میں آئی ہے کہ حضرت کے حصے کی چائے بھی ان کی ناک ہی نوش فرما جاتی ہے۔ یہ بات حضرت کو اکثر غمناک کردیتی ہے۔ بلکہ نم ناک کردیتی ہے۔

چینی کے کپ کی دستی جیسے کان چہرے کی شادابی کی ضمانت اور انھیں سُر اور لے سے روشناس کروانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

باریک گلابی ہونٹ جب ملتے ہیں تو جلترنگ کی آواز آتی ہے اور ساتھ ہی دہنِ مبارک سے ہلکے ہلکے پانی کے قطرے ماحول کو معطر اور تر کردیتے ہیں۔ مگر یہ خطرہ ان پر آویزاں رہتا ہے کہ ماحول کو بارش عطا نہ کردیں۔ اگر ابھی تک آپ مطلوبہ و مذکورہ شخص تک نہیں پہنچ سکے تو یہ حکومتِ وقت کی نااہلی ہے۔

دراز قد یہ شخص اگر "ہوشیار" کی پوزیشن میں کھڑا ہو تو سرِ انور اپنے عمودی محور سے ذرا دائیں کندھے کی جانب جھک جاتا ہے۔

چوڑی چھاتی بالوں سے لبریز ہے اور بالوں کا یہ سلسلہ ہمالیہ جیسے پیٹ پر سے گزرتا ہوا وادیء ناف تک جا کر ختم ہوجاتا ہے۔ راستے میں کئی نانگا پربت اور راکاپوشی بھی آتے ہیں۔ وہ پیٹ جو کبھی کبھی شرٹ کے بٹنوں میں سے باہر جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

موصوف جب چلتے ہیں تو دائیں پاؤں کو بائیں پاؤں سے پہلے اور بائیں پاؤں کو دائیں پاؤں سے پہلے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ چلنے والے کو رکشہ کروائے بنا ساتھ چلنا محال ہوجاتا ہے۔

طبیعت میں لطافت، ظرافت، ذہانت، شرافت، صداقت، امانت، دیانت اور حماقت اوہو سوری شجاعت اور عجز وانکساری، رواداری وغم گساری کا یہ عالم ہے بلکہ المیہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ عزت واحترام کے ساتھ پیش آنا شاید ان کی گھٹی میں شامل ہے۔ (وہ ہمدرد والی گھٹی نہیں) علم وادب کا یہ روشن چراغ سرزمینِ علی پور چٹھہ کا وہ روشن اور درخشندہ ستارہ ہے جس کی بدولت لوڈشیڈنگ کا احساس قدرے کم کم محسوس ہوتا ہے۔ موصوف کے نزدیک ادراک ادرک کی جمع ہے اس لئے ہر کھانے میں ادرک کا استعمال لازمی سمجھتے ہیں۔ مہمان نواز، ملن سار اور غالب کے معشوق کے جیسے وعدے کے پابند، ادبی تنظیم دھنک کے سات رنگوں میں بنیادی رنگ اور اردو ادب کی خدمت میں اپنا نمایاں کردار ادا کرکے ملک وقوم کی خدمت اور نوجوانانِ پاکستام کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرکے بیروزگاری کی ڈولی میں بٹھانے میں اپنا اہم کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنے والا یہ شخص پیشے کے اعتبار سے ایک معلم ہے جو گورنمنٹ ایلیمنٹری سکول کوٹ رہاڑ میں بچوں کو سارا دن مرغا بنانے میں کوشاں رہتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بچے کسی روز بانگیں دینا شروع کردیں۔ جی ہاں میری مراد جناب ثاقب تبسم ثاقب ہے، جو کبھی نگینہ ہوا کرتے تھے۔

ثاقب تبسم ثاقب علمی، وادبی اور قلمی اور فلمی اعتبار سے قابلِ فخر اور قابلِ رشک اور قابلِ حسد انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے علم وعمل میں ترقی واضافہ فرمائے اور اسے کوئی اچھا کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور سرزمین علی پور چٹھہ کو اس نگینے کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

شہرِ سخن

عامر بن علی/ جاپان

اقوام متحدہ کا ادارہ برائے تعلیم و ثقافت یونیسکو کے نام سے جانا جاتا ہے۔امن اور تحفظ عامہ کے مقصد کے تحت قائم ہونے والے اس ادارے کا منشور ہے کہ ثقافتی ملاپ اور تعلیم و سائینس کے شعبے میں عالمی سطح پر تعاون سے بین الاقوامی امن و امان کا حصول ممکن ہے۔اقوام متحدہ کے اس ذیلی ادارہ کی جانب سے لاہور کو ادب کا شہر قرار دیا گیا ہے۔لاہور پاکستان کا پہلا شہر ہے جسے اس قسم کا اعزاز یونیسکو سے ملا ہے۔شہرِ لاہور صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔اس پس منظر میں اسے عالمی ادارے کی جانب سے ادب کا شہر قرار دیا جانا، ایک مستحسن اقدام ہے۔اور اس شہر کے ایک تاریخی وصف کا اعتراف بھی ہے۔

مغل بادشاہ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہان نے اپنے ایک فارسی شعر میں لاہور کو اپنی جان کے برابر قیمت ادا کر کے خرید کر بھی سستا خرید لینے کا اعلان کیا ہے۔وہی ملکہ نور جہاں جو برصغیر پاک و ہند کی واحد خاتون ہے جن کے نام کے سکّے جاری ہوئے۔شہنشاہ جہانگیر نے جو اپنی زندگی کی محدود ڈھائی ضرورتیں بتائیں ان میں سے ایک یہی شاعرہ ملکہ بیان کی گئی ہیں۔اپنی زندگی کی آخری دو دہائیاں لاہور میں گزار کر اسی شہر میں اپنے شوہر شہنشاہ کے قریب مدفون ہیں۔یہ مقبرہ بھی ملکہ نے خود تعمیر کروایا تھا۔اس وضاحت کی طوالت کی وجہ یہ بھی ہے کہ بار بار ذہن نور جہان کا نام سن کر ملکہ ترنم نور جہان کی طرف جاتا ہے۔میڈم نور جہاں نے گرچہ لاکھوں دلوں پر حکومت کی ہے اور لاہور کی آن بان شان ہیں، مگر یہاں ملکہ نور جہان سے مراد مغل شہنشاہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔جن کا یہ شعر ان کے شاہدرہ میں واقع مزار کی لوح پر درج ہے۔

بر مزارِ ما غریباں نی چراغی نی گلی
نی پرِ پروانہ سوزد نی صدائ بلبلی

مغلیہ عہد سمیت ایک ہزار سال تک لاہوری ادب زیادہ تر فارسی زبان میں تخلیق کیا گیا ہے۔بعض دوستوں کے لئے شاید یہ حیرت کا سبب ہو کہ راجہ رنجیت سنگھ اور تمام سکھ عہد میں تختِ لاہور کی سرکاری زبان فارسی تھی۔فارسی زبان اور شہر کے اسی ایک ہزار سال پر محیط باہمی تعلق پر گورنمنٹ کالج کی فارغ التحصیل ہماری ہم مکتب ساتھی سکالر ڈاکٹر انجم طاہرہ نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے، فارسی زبان میں شائع ہونے والی ''لاہور در شعرِ فارسی'' ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔فارسی اب لاہور میں چونکہ زیادہ مقبول نہیں رہی، اس لئے اس زبان میں تخلیق کیا گیا ادب بھی اب ویسا مقبول نہیں رہا جیسا کبھی ہوا کرتا تھا۔

مقامی زبانوں کی بات کریں تو شاہ حسین سے چراغوں کا ایک سلسلہ علامہ اقبال اور فیض احمد فیض تک آتا ہے۔اگرچہ بلھے شاہ قصور اور وارث شاہ شیخوپورہ میں مدفون ہیں مگر دونوں کا پیرخانہ لاہور میں ہی تھا اور ان کے مرشد عنائیت قادری اسی شہر میں دفن ہیں جن سے کسبِ فیض کیا۔سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی سے لے کر انتظار حسین، اشفاق احمد، منو بھائی، منیر نیازی ایک طرف شعر و سخن سے اس شہر کی فضا مہکاتے رہے تو دوسری جانب استاد دامن اور حبیب جالب جیسے عوام دوست انقلابی قرطاس و قلم کو وقار بخشتے رہے۔ساغر صدیقی اور ناصر کاظمی نے اک نئے رنگ اور آہنگ کو روشناس کرایا تو پطرس بخاری اور ن م راشد نے بھی دبستانِ لاہور کو اپنے فن سے رونق بخشی۔اہلِ قلم کی ایک الگ نوعیت کی کہکشاں لاہور فلم انڈسٹری کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ادبی افق پر نمودار ہوئی۔احمد راہی، تنویر نقوی، مسرور کاظمی، احمد عقیل روبی کا نام فقط حوالے کے طور پر تحریر کر رہا ہوں۔ایک طرف شو بز سے وابستہ اہلِ سخن تو دوسری طرف راہِ سلوک کے مسافر ادیب اور شاعر اس نگر سے گزرے ہیں۔اپنی تحریر سے خوشبو پیدا کرنے والے اور اپنے حرفوں کی روشنی سے بھٹکے ہوؤں کو صراط مستقیم دکھانے والے واصف علی واصف ایک انوکھے اور لازوال رنگ ڈھنگ کے طرزِ تحریر کی بنیاد رکھ گئے۔

لاہور کے ادبی منظر نامے کا ایک تاریخی حصہ ادبی محافل رہی ہیں۔اس شہر کے اہل حرف کی بیٹھک گزشتہ ایک صدی سے عموماً چائے خانوں اور کافی ہاؤسز پر ہوا کرتی تھی۔شاعری اور نثر کے تازہ تخلیقی نمونے یہاں برپا ہونے والی تنقیدی نشستوں میں پیش کئے جاتے تھے۔اور صاحبِ کلام اکثر پیش کرنے کے بعد پچھتاتے تھے، چونکہ بقول شخصے اس شہر کے نقاد بہت ظالم اور سنگ دل واقع ہوئے ہیں۔اس عہد رفتہ کی واحد یادگار پاک ٹی ہاؤس ہے۔یہ چائے خانہ لاہور کی ایک صدی کی ادبی تاریخ کا عینی شاہد ہے۔یہ بھی ٹھکانہ باقی نہ رہتا اگر نواز شریف حکومت اس سلسلے میں خصوصی کاوش نہ کرتی اور معاصر لکھاری مسلسل اس کی بحالی کا مطالبہ شدومد سے جاری نہ رکھتے۔میں چونکہ گورنمنٹ کالج کے نیو ہاسٹل میں مقیم تھا، اس لئے زمانہ طالب علمی میں پاک ٹی ہاؤس اکثر پیدل چلا جاتا تھا۔منو بھائی بھی کسی زمانے میں وہاں مستقل جاتے تھے۔ایک بار ان کے گھر ملنے گیا تو پوچھنے لگے کہ آج کل بھی ٹی ہاؤس جاتے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا کہ کبھی کبھار۔کہنے لگے کہ اچھا کرتے ہو، اسی لئے تمہاری صحت بہتر لگ رہی ہے۔شہرت بخاری، خالد احمد، محسن نقوی، اسلم کولسری، شہزاد احمد، مشکور حسین یاد، بانو آپا کتنے سارے ستاروں جیسے نام ہیں جو پاک ٹی ہاؤس کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں چمک اٹھے ہیں۔یہ انہی رفتگان کا فیض ہے کہ اقوام متحدہ جیسے معتبر ادارے نے داتا کی نگری کو ''شہرِ سخن'' قرار دے دیا ہے۔رنگوں، خوشبوؤں اور روشنی کا یہ ادبی سلسلہ آج بھی بڑے پر وقار اور معیاری انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔لاہور کی یہ خوش قسمتی ہے کہ پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے سینکڑوں اہلِ قلم اس ادبی فضاء کو معطر کرنے میں مصروف عمل ہیں۔خدا اس شہرِ سخن اور اس کے سخنوروں کے ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

ڈنک

بشریٰ رحمٰن

''لیں باجی جی آ گئی ہے نامراد، بات کرلیں اس سے.....''

اخبار پڑھتے ہوئے میں نے نظریں اُٹھائیں۔ میری نوکرانی سرداراں ایک نوجوان لڑکی کو ساتھ لیے کھڑی تھی۔ میں نے عینک اُتار کر اس کی لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کے دائیں بائیں دو صاف ستھرے بچے بھی کھڑے تھے۔ لڑکی آٹھ برس کی ہوگی اور لڑکا ہوگا کوئی پانچ برس کا..... بچے بھی بہت سہمے ہوئے لگ رہے تھے۔ لڑکی کی عمر 26/27 برس کی ہوگی۔ انتہائی دبلی پتلی، سانولے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی تمیز دار ہی لگ رہی تھی۔

یہ تمہاری بیٹی ہے..... میں نے سرداراں سے پوچھا۔

''جی باجی جی!''

میں نے لڑکی سے کہا بیٹھ جاؤ۔ وہ زمین پر ہی بیٹھ گئی اور دونوں بچے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

سرداراں اندر کچن میں جانے لگی تو میں نے اسے کہا ''ان دونوں بچوں کو اندر لے جاؤ اور انہیں ناشتہ کراؤ۔ سرداراں میرا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے دونوں بچوں کو بازوؤں سے پکڑ کے اُٹھایا تو وہ لڑکی بولی ''باجی جی! یہ ناشتہ کر کے آئے ہیں۔''

کوئی بات نہیں..... میں نے کہہ کر سرداراں کو دوبارہ اشارہ کیا۔ وہ بچوں کو چمکار کر اپنے ساتھ لے گئی۔

سرداراں کو میرے پاس ملازم ہوئے دو سال ہوئے تھے۔ صفائی کا سارے کام کے علاوہ وہ کپڑے دھو کر استری کرتی تھی۔ کبھی کبھی جب خانساماں چھٹی پہ جاتا تو کچن کا کام بھی کر دیتی تھی۔ اس کی ایک لڑکی تھی جس کی اس نے کم عمری میں شادی کر دی تھی۔ اب کچھ عرصہ سے وہ اپنی لڑکی کے بارے میں فکرمند رہتی تھی اور چاہتی تھی کہ لڑکی اپنے شوہر سے طلاق لے لے اور دوبارہ کسی اچھی جگہ اس کی شادی کر دے گی۔ رشتہ بھی اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ مگر لڑکی مان نہیں رہی تھی۔

سرداراں اور بچے جب چلے گئے تو میں نے لڑکی سے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

بولی ''مہ وش''

میں مسکرائی ''تم لوگ بڑے گھرانوں میں کام کرتی ہو تو نام بھی ویسے ہی رکھ لیتی ہو۔''

''بس جی! یہ نام میری ماں نے رکھ دیا تھا۔ پر جی نام رکھنے سے کوئی تقدیر تو بڑے لوگوں والی نہیں ہو جاتی۔ کام تو نوکروں والا ہی کرنا ہوتا ہے۔''

''کیا کام کرتی ہو؟''

''جی محلے میں ایک بیوٹی پارلر ہے۔ وہاں صفائی، دھلائی اور اُوپر کا چھوٹا موٹا کام کر دیتی ہوں۔''

''تنخواہ کیا ملتی ہے؟''

''دس ہزار روپے.....''

''کتنے گھنٹے کام کرتی ہو؟''

''صبح آٹھ بجے جاتی ہوں۔ رات آٹھ بجے آتی ہوں۔ بعض دفعہ لیٹ بھی ہو جاتی ہوں۔''

''ان پیسوں میں تمہارا گزارہ ہو جاتا ہے؟''

''جسے گزارہ کہتے ہیں وہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ جمعے کو مجھے چھٹی ہوتی ہے۔ اس دن دو چار بڑے گھرانوں میں ان کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی ہوں۔ کچھ پیسے وہاں سے مل جاتے ہیں۔ فرصت کے وقت میں لوگوں کے کپڑے سی دیتی ہوں۔''

''اتنی کمزور سی جان ہے تمہاری اور دن رات محنت کرتی ہو۔''

''بچوں کے لیے تو دکھ جھیلنے پڑتے ہیں باجی''

''کیا کرتا ہے تمہارا شوہر..... کہاں ہوتا ہے؟''

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی ''میرا شوہر ٹرک ڈرائیور ہے۔ ہائی وے پر ٹرک چلاتا ہے۔''

''مگر تیرا خیال تو نہیں رکھتا۔ ایسے شوہر کی بیوی بن کر رہنے سے کیا فائدہ؟''

''یہ سب میری ماں نے آپ کو بتایا ہوگا باجی؟''

اس نے اپنی بڑی بڑی اُداس آنکھیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔

''ہاں تیری ماں نے ہی بتایا ہے کہ وہ نکھٹو ہے۔ تیری کفالت نہیں کرتا۔ تجھے مارتا بھی ہے۔''

''اور میری ماں نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ وہ جو بازار میں دودھ دہی بیچنے والا نبی بخش ہے وہ مجھ پر فدا ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں گلاب خان سے طلاق لے لوں اور اس سے شادی کر لوں۔''

''ہاں.....'' میں نے اس کے جواب پر ایک لمبی سانس کھینچی۔ ''تو تو اپنی ماں کی بات مان کیوں نہیں لیتی؟''

''باجی جی..... اپنے تن سے کپڑا اُٹھاؤ تو اپنا ہی پنڈا ننگا ہوتا ہے۔ مجھے پتہ تھا میری ماں نے آپ کو غلط سلط بتا کے مجھے قائل کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ روز کہتی تھی ایک بار میری باجی سے مل لو۔ آج میں آپ کو یہ بتانے کے لیے آ گئی ہوں۔ باجی جی! آپ میری ماں سے پوچھیں جب میں دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی تو اس نے میرے باپ کی عمر کے بندے سے میری شادی کیوں کر دی۔ میں نے تو اس وقت بغاوت نہیں کی تھی۔ اب میرے دو بچے ہیں۔ میرا

شوہر سال میں ایک دو مرتبہ آتا ہے۔ چند دن میرے پاس رہتا ہے۔ جس کوارٹر میں میں رہتی ہوں اس کا سال بھر کا کرایہ دیتا ہے۔ بچوں کو کپڑے دلاتا ہے۔ کچھ دن رہ کر چلا جاتا ہے۔ اس کا کام ہی ایسا ہے۔''

''وہ تمہیں اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا؟''

''کیسے رکھے جی..... وہ ریاست سوات میں رہتا ہے۔ وہاں اس نے اپنے قبیلے میں شادی کر رکھی ہے۔ دوسری بیوی اس کی پشاور میں رہتی ہے۔ تیسری شادی اس نے مجھ سے کی اور اب ایک سال ہوا اس نے کراچی میں ایک شادی کر لی ہے۔ جب کبھی اسے میرا خیال آتا ہے، آ جاتا ہے۔''

''کیا تیری ماں کو معلوم نہیں تھا کہ پہلے اس کی دو بیویاں ہیں۔''

''معلوم کیوں نہیں تھا جی..... اس وقت وہ میری ماں کو مال کھلا رہا تھا۔ اس لیے ماں کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔''

''اور اب.....؟''

''اب وہی مال ماں کو نبی بخش کھلا رہا ہے۔ باجی جی! نبی بخش اس بازار کا غنڈہ ہے۔ میں باہر نکلتی ہوں تو مجھے آنکھیں مارتا ہے۔ فحش اشارے کرتا ہے۔ اس کے بھی پہلے بیوی بچے ہیں۔''

''کیا تیری ماں کو ان باتوں کا پتہ نہیں.....؟''

''پتہ کیوں نہیں ہے۔ رات کو اسی کی کوٹھڑی میں جا سوتی ہے۔''

میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ خاموش نہیں حیران ہو گئی کہ سرداراں ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے۔

بے رنگ سے کچھ آنسو اس کی آنکھوں میں آ رہے تھے۔ اس نے اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے۔ دوپٹے کو سنوارا اور بولی ''باجی جی! میں اپنی ماں کی طرح کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ بس آپ میرا منہ نہ کھلوائیں..... میں اس کے کہنے پر کسی دوسرے آدمی سے شادی کر لوں گی تو کیا ہو گا..... دو چار ماہ میں اس کا شوق بھی اُتر جائے گا یا بیٹھی اس کے بچے پیدا کرتی رہوں گی۔ وہ کبھی میرے دو بچوں کا سہارا نہیں بنے گا۔ کبھی کبھار میرا شوہر آ جاتا ہے۔ بچوں کو عیش کراتا ہے اور کیا کہوں جی.....''

''یہ بچھو ہے نا!'' اس نے ہاتھ سے اپنی ناف کے نیچے اشارا کیا ''اس کا ڈنک نکال جاتا ہے۔ میں اس کا ڈنک نکلوانے کے لیے گنہ کی زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ میری ماں نے جوانی میں میرے باپ سے طلاق لے لی تھی۔ تو آج تک ڈنک نکلواتی پھرتی ہے۔''

''باجی جی! یہ جو روٹی ہوتی ہے نا اناج کی، جب پیٹ میں جاتی ہے تو تقاضا بھی کرتی ہے۔ اس کا تقاضا کیچڑ میں لے جاتا ہے۔ اچھا باجی مجھے اجازت دیں۔'' وہ کھڑی ہو گئی اور اپنے بچوں کو پکارا۔

''سلمان، صدف آ جاؤ بھی.....''

''بڑے اچھے نام رکھے ہیں تم نے بچوں کے۔'' میں نے کہا۔

بچے دوڑ کر باہر آ گئے۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

''باجی جی! آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ سنا ہے کالج میں پڑھاتی ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہے خاوند کیسا بھی ہو ایک بہت بڑا چھپر ہوتا ہے۔ جتنے روز میرا خاوند میرے پاس رہتا ہے بازار والوں کو جرات نہیں ہوتی نظر اُٹھا کر مجھے دیکھیں۔ اپنا مرد ہی اپنا آسمان ہوتا ہے جی۔ آپ خود سمجھدار ہیں۔ آپ کو کیسے بتاؤں کہ باہر کا مرد کتنا گندہ ہوتا ہے۔ گندہ سمجھتی ہیں.....؟''

یہ کہا..... دوپٹہ سنوارا اور دونوں بچوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے آہستہ آہستہ باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑ گئی۔

اسلم سحاب ہاشمی/ ساہیوال

میں اک رُخ میں کئی چہرے اُبھرتے دیکھ لیتا ہوں
بہاروں میں کئی منظر سلگتے دیکھ لیتا ہوں
سرابِ عمر کو دریا سمجھنے والے لوگوں کے
دلوں میں خوف کے منظر اُبھرتے دیکھ لیتا ہوں
جو مجبوری کے رستے پر چلے جاتے ہیں اُن کے بھی
میں اکثر آنکھ میں آنسو چھلکتے دیکھ لیتا ہوں
تری لمبی مسافت کی کہانی تیرے چہرے پر
میں منظر کو پسِ منظر میں ڈھلتے دیکھ لیتا ہوں
برستی چاندنی میں شب کا آنچل بھیگ جاتا ہے
جو اُس کے پردۂ رُخ کو سرکتے دیکھ لیتا ہوں
غموں کے بوجھ سے بوجھل ہوا جب ہونے لگتی ہے
سحاب اشک عالم پر برستے دیکھ لیتا ہوں

✧✧✧

رومان و محبت کی کہانی طے شد
اس عمر کے صحرا میں جوانی طے شد
کب تک دلِ مضطر کا نشانہ بنتا
جذبات کے طوفاں کی روانی طے شد
ہر صفحے پہ مسطور ہے جلوہ کوئی
وحدت کے ہوئے مجھ پہ معانی طے شد
محمل کا ہٹایا ہے ہوا نے پردہ
دیوانوں کی آشفتہ بیانی طے شد
سب پیر و جواں عجز کا پیکر ہیں بنے
عشاق تھے سب فرقِ زمانی طے شد
تو رقص کناں آئے کوئی مست یہاں
تا شہر سے ہو فرقہ ورانی طے شد
محتاج ہیں سب چشمِ کرم کے تریے
ہوتا ہے وہ پھر دردِ نہانی طے شد
دیوار کے سائے کو بھی ہے خوفِ فنا
ہے وقتِ زوال اس کی گرانی، طے شد
وہ آنکھ میں شعلہ لیے پھرتا ہے سحاب
اب آنکھ سے وہ اشک فشانی طے شد

ناموس کی قیمت

فیروز عالم

شام ہوگئی تھی۔ مجھے ریاستی جیل دس بجے سے پہلے پہلے پہنچنا تھا۔

میں جیل خانہ جات کے محکمے میں چیپلین ہوں۔ اگرچہ اسلامی ممالک یا اسلامی اصطلاحات میں چیپلین کا کوئی ذکر نہیں مگر امریکا میں مذہبی صلاح کاروں کے لئے، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اگر کچھ لوگوں کو سکون کی ضرورت ہو اور انہیں اپنے عقیدے کے مطابق مشورہ دیا جاسکے تو اس مقصد کے لئے ہر مذہب کے پیشواؤں کو ملازم رکھا جاتا ہے۔ یہ چیپلین خطرناک بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو، موت کی سزا پانے والے قیدیوں کو، جنگ میں محاذ پر جانے والوں اور ایسے ہی دیگر لوگوں کو تسلی دینے، انکی تفکرات بٹانے اور انہیں نفسیاتی سہارا دینے کا کام انجام دیتے ہیں۔ شاید اسکی ابتدا عیسائی مذہب کی اس روایت کے بعد پڑی تھی جب گناہ گار اپنے گناہ بخشوانے کے لئے ایک جالی کے پیچھے جا کر اپنے پادری سے اعتراف گناہ کرتے تھے۔ بہر حال آج میری یہ ذمہ داری تھی کہ ایک پاکستانی نژاد مسلمان قیدی سے ملاقات کروں۔

ایک سرخ پتھر سے بنی بے رونق اور قدرے پرانی عمارت کے بلند اور آہنی دروازے سے گذر کر میں نے ڈیوٹی افسر کو قیدی احمد شاہ سے ملاقات کے کاغذات دکھائے۔ اجازت ملنے پر نیم تاریک راہداریوں سے گذرتے ہوئے میں ایک چھوٹے سے کمرے کے سامنے پہنچا۔ گارڈ نے اپنی کمر سے بندھا ایک بھاری چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازے کا تالا کھولا، ایک کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہوا۔ احمد شاہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بلند آواز سے مجھے السلام علیکم کہا اور مجھے ایک زنگ آلود ٹین کی کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ پھر کہنے لگا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے ہیں۔ آج میری زندگی کی آخری رات ہے۔ یہ یہاں کا دستور ہے کہ موت کی سزا پر عمل درآمد کرنے سے پہلے قیدی کو اپنے مذہبی پیشوا سے ملوایا جاتا ہے۔ ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی میں ان سے درخواست کرتا کہ مجھے آپ سے ملنے کی اجازت دی جائے کیونکہ میں اس دنیا سے جانے سے پہلے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح میرے لئے مرنا آسان ہوجائے۔''

امریکا مغربی ممالک میں واحد ملک ہے جہاں اب بھی چند انتہائی بھیانک اور ظالمانہ جرائم کے نتیجے میں سزائے موت پر عمل کیا جاتا ہے۔

احمد شاہ کو بھی نہ صرف اسکے جرم ثابت ہونے پر بلکہ اسکے اپنے اعتراف کرنے پر سزائے موت دی گئی تھی۔ اسکے پاس صرف چند گھنٹے تھے اور اُس کو رات کے ایک بجے ایک زہریلے انجکشن کے ذریعے ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دینا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ ایک شفاف شلوار قمیض کا جوڑا پہنے تھا اس نے اس سے پہلے غسل کیا تھا کونے میں جانماز بچھی تھی اور ایک طرف رحل پر قرآن رکھا تھا اس نے اپنے رب سے ملنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ اس پر موت کا کوئی خوف نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سا غم تھا، شاید پچھتاوا بھی۔ مجھے اس کے جرم کی مکمل تفصیل معلوم تھی کیونکہ امریکی پریس اور ٹیلی وژن نے اس واقعہ کی خوب خوب تشہیر کی تھی مگر میں یہاں اس سے اسکے جرم پر کوئی بحث یا مزید جرح کرنے نہیں آیا تھا بلکہ ان آخری لمحات میں اسے جذباتی سہارا و سکون دینے آیا تھا۔ میں نے ایک میٹھے اور ہمدردانہ لہجے میں اس سے کہا ''احمد شاہ میں اسی لئے آیا ہوں کہ تم سب کچھ بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرو۔ میں سننا چاہتا ہوں، ہر وہ چیز جو تم مجھے سنانا چاہتے ہو'' اس نے میری طرف دیکھا۔۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر جیسے ایک بند ٹوٹ گیا اس نے کوشش کی کہ اپنے جذبات پر قابو رکھے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسکیاں لیتے ہوئے رندھی آواز میں کہا ''میں وہ آنکھیں نہیں بھول سکتا وہ معصوم آنکھیں، کیسی بیچارگی، کیسا پیار بھرا شکوہ اور کیسی حیرانگی تھی ان آنکھوں میں۔۔'' میں کچھ دیر خاموش رہا تا کہ وہ پرسکون ہو جائے۔ پھر کہنے لگا ''مگر مجھ پر تو خون سوار تھا، مجھے یقین تھا کہ میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں اس میں اللہ کی رضامندی شامل ہے اور میرے قبیلے اور میرے مذہب کی روایت کا یہی تقاضہ ہے جو مجھے پورا کرنا ہے''

احمد شاہ آزاد علاقے کا رہنے والا تھا۔ خوبصورت علاقہ، سرسبز وادیاں، شور مچاتے دریا و گنگناتے آبشار۔ وہاں رہنے والے سب غریب تھے مگر اپنے حال میں خوش اور قناعت پذیر تھے۔ پھر دنیا ایک نئے دور سے گذری جب دوریاں سمٹ گئیں جیسے دور دور کے ملک قریب آ گئے ہوں ایک غلغلہ تھا کہ ملک باہر سے چلو۔ ترقی یافتہ ممالک میں افرادی قوت کی کمی تھی۔ ہر شخص باہر جانے کی جد و جہد میں مبتلا تھا۔ زیادہ تر لوگ مشرق وسطی کے ممالک کا رخ کر رہے تھے۔ احمد شاہ بھی اسی دوڑ میں شامل ہوگیا۔ اسکا ایک دوست امریکا پہنچ گیا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح احمد شاہ کو بھی امریکا بلوالیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نہ صرف امریکا آنا آسان تھا بلکہ یہاں آکر غیر قانونی طور پر ہمیشہ کے لئے بس جانا بھی ممکن تھا۔ لاکھوں

لوگ اسی طرح غیر قانونی طور پر یہاں بسے ہوئے تھے اور ہر دس بارہ سال بعد ان سب غیر قانونی طور پر آباد شدہ لوگوں کو عام معافی کے ساتھ امریکی شہریت مل جاتی تھی۔

احمد شاہ بھی شروع شروع انہی حالات سے گذرا، اپنوں اور اپنے گاؤں کی یاد، تنہائی، سخت مشقت اور سب سے بڑھ کر طرز زندگی اور سماجی طور طریقوں کا فرق۔ وہ جن قدروں کی پابندگی کرتے ہوئے جوان ہوا تھا انکا اس مغربی معاشرے میں کوئی وجود نہ تھا۔ کبھی دل چاہتا کہ سب کو آگ لگا کر واپس چلا جائے، انہی وادیوں انہی پہاڑوں اور انہی کچی اور چھوٹی چھوٹی پگ ڈنڈیوں کی طرف، جواب بھی اسے پکارتی تھیں۔ لیکن پھر امریکا کا معیار زندگی، مالی فارغ البالی اور وطن میں اپنے کنبے کی خستہ حالت اس کے قدم روک لیتی۔

انسان بھی کیسا عجیب جانور ہے، رفتہ رفتہ ہر جگہ وہ اپنا دل لگا ہی لیتا ہے۔ تاریخ ان واقعات سے بھری ہے۔ جب انگلینڈ کے سزا یافتہ قیدیوں کو ایک بحری جہاز آسٹریلیا کے ویران اور غیر آباد ساحل پر چند ضروری اشیاء کے ساتھ اتار کر واپس مڑا تھا تو کئی قیدی روتے پکارتے اسکے پیچھے کافی دور تک سمندر میں دوڑتے آئے تھے۔ افریقہ سے جانوروں کی طرح جال میں پکڑ کر امریکا لائے جانے والے سیاہ فام غلاموں کا بھی دل لگ ہی گیا تھا اور انیسویں صدی میں غلاموں ہی کی طرح جزائر غرب الہند میں انگریزوں کے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے ہندوستان سے جو مزدور لائے گئے تھے وہ بھی راتوں کو آہ وزاری کرتے تھے، پھر یہیں کے ہو رہے۔ احمد شاہ تو پھر امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں تھا جہاں ہر قسم کی آزادی اور ہر چیز کی فراوانی تھی اس کا دل بھی رفتہ رفتہ لگ گیا مگر اسے تنہائی اب بھی ستاتی تھی۔ اس کے چند دوست مکمل طور پر امریکی طرز زندگی اختیار کر چکے تھے، کہ وہ یہاں کی بے راہ روی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے ان کے بقول یہ تو بہتا دریا ہے ہر وہ چیز جو انہیں اپنے وطن میں نہیں ملی تھی یہاں مفت دستیاب تھی۔ مگر وہ ان سب سے مختلف تھا اسے بچپن کی یہ کہانی یاد تھی کہ خدا تو ہر جگہ ہے اور ہر وقت اپنے بندے پر نظر رکھتا ہے۔ احمد شاہ کو یہ سب کچھ بہت برا لگتا تھا۔ وہ ہر حالت میں انہیں قدروں، انہی پابندیوں کی پاسداری کرتا تھا جن کے ساتھ وہ پلا بڑھا تھا۔ جیسے ہی اس کو رہائش کے قانونی کاغذات ملے اس نے وطن جا کر شادی کی اور بیوی کو امریکا لے آیا۔ اب جیسے زندگی میں بہار آ گئی۔ اسکی تنہائی میں کسی کی موجودگی سے جیسے چہار طرف اپنائیت کی خوشبو پھیل گئی اور رات کے ریشمی اندھیرے کسی کی قربت سے جگمگا اٹھے۔ پھر ایک ہی سال بعد جب ایک نرس نے ہلکے گلابی رنگ کے نرم کمبل میں لپٹی ایک پیاری سی بچی کو اس کی گود میں دیا تو وہ ایک خوشی، ایک ایسی لذت سے دوچار ہوا جس کا تصور وہی کر سکتے ہیں جو پہلے پہلے باپ بنے ہوں۔ وہ کبھی دیوانہ وار اپنی گڑیا کی پیشانی چومتا اور کبھی اسکی ننھی ننھی انگلیوں کو باری باری اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکے ہلکے سہلاتا۔ وہ جب اپنی کالی کالی آنکھیں کھولتی تو اسکا دل چاہتا کہ ان آنکھوں کو چوم لے۔ وہ اسکی اپنی تھی، اس کے اپنے وجود کا سایہ تھی وہ اس کے لئے جینے کا پیغام تھی۔

پھر جیسے اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا۔ اب اسکی ساری مشقت کا مرکز، اسکی زندگی کا مقصد اور اسکی خوشیوں کا منبع اسکی بیٹی تھی جسکا نام اس نے طاہرہ رکھا تھا۔ وہ تھی بھی طاہرہ، پاکیزہ اور صبح کے پہلے پہلے پھول پر پڑی شبنم کے قطرے کی طرح خالص۔ پھر وہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی نت نئے تماشے اور شرارتیں کرنا سیکھ گئی تھی۔ وہ اس کے لئے ایک جیتا جاگتا کھلونا بن گئی تھی۔ اب اس کا کام پر دل نہیں لگتا، چاہتا کہ جلد سے جلد گھر پہنچ جائے اور اسے سینے سے لگا لے۔ اس کے گھر پہنچتے ہی وہ دوڑ کر اسکے پیروں سے لپٹ جاتی اور جب وہ اسے گود میں اٹھاتا تو اس سے پہلے کہ وہ اسے پیار کرے وہ اپنے نرم نرم ہونٹ پہلے اسکے دائیں اور پھر بائیں رخسار پر رکھ کر اس کو پیار کرتی۔ اسے ایسا لگتا جیسے وہ آسمان کی وسعتوں میں اڑ رہا ہو۔ اس کا دل مسرت و انجانے غرور سے بھر جاتا۔ وہ اسکی ننھی سی پری تھی جو اسکے لئے مسرت و شادمانی کی نوید بن کر آئی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امریکا میں تارکین وطن کی پہلی نسل پیدا ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے جو لوگ اپنا وطن چھوڑ کر آئے تھے انکا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد، اپنی تعلیم مکمل کر کے یا نوکریاں اور سرمایہ جمع کرنے کے بعد واپس وطن جا کر آباد ہو جائینگے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ جائینگے۔ اب انکی نئی نسل کی پیدائش کے بعد انکے ذہن میں کچھ سماجی مسائل بھی اٹھتے تھے۔ ہر محفل میں یہی بحث ہوتی کہ ان کے بچوں کا کیا ہوگا اور یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ماحول میں پل بڑھ کر یہ اپنا مذہب اپنی قدریں اور اپنی روایات بھول جائیں۔ وہ یہاں کی جنسی بے راہ روی، اولاد کی نافرمانی اور کنبے پر امریکی معاشرے کے منفی اثرات سے نالاں اور بڑی حد تک خوف زدہ تھے۔ خاص طور سے انکی طرف دیکھ کر، جن کی بیٹیاں تھیں، یہ ضرور کہا جاتا تھا کہ بھئی بڑا برا زمانہ ہے تمہاری بیٹیاں کیسے اس ناپاک ماحول سے اپنا دامن بچائینگی۔۔ سوچ لو۔ کیا اس گناہ گار معاشرے میں تم اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کر پاؤ گے؟؟ اس کا جواب ابھی تک کسی کے پاس نہ تھا۔ چھوڑے ہوئے

وطن کا یہ دہرا معیار یہاں بھی قائم تھا کہ بیٹوں کی تو کوئی فکر نہیں کہ ''یہ تو لڑکا ذات ہیں مگر بیٹی۔۔۔؟''

طاہرہ اب جوان ہو رہی تھی۔ وہ ہائی سکول میں تھی۔ بدقسمتی سے اس شہر میں اسکے ہم وطنوں کی کوئی بڑی کمیونٹی نہیں تھی۔ نہ ہی اسکی اپنی کوئی بہن یا بھائی تھا۔ اس کی زیادہ تر سہیلیاں امریکی تھیں جن کے ساتھ وہ پل بڑھ کر جوان ہو رہی تھی۔ ان کے ساتھ اسکا ایک ذہنی اور جذباتی بندھن بن گیا تھا وہ انہی کے انداز سے انگریزی بولتی تھی انہی کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تھی، انہی کے ساتھ گھومتی تھی اور اسکول میں انہی کی طرح ہر ایکٹیوٹی میں حصہ لیتی تھی۔ اسکے ماں باپ اسے سمجھاتے تھے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب معصوم سی تفریحیں ہیں اس لئے اس پر کوئی پابندی نہیں لگاتے تھے۔ مگر جب وہ کچھ اور بڑی ہوئی تو طاہرہ کو اس کا احساس ہوا کہ اس کو ایسی بہت سی چیزیں کرنے کی اجازت نہیں جو اسکی ساتھی امریکی لڑکیاں کرتی ہیں۔ وہ جب ان لڑکیوں کو تیراکی کے تالاب میں چھلانگیں لگاتے دیکھتی، اسکول کے بعد فٹبال کے میدان میں چھوٹے چھوٹے شورٹس پہن کر فٹ بال کھیلتے دیکھتی اور خاص طور پر جب لڑکیاں کلاس کے سالانہ بال روم ڈانسنگ کے مقابلے میں بن سج کر شریک ہوتیں اور وہ گھر کی تنہا اور بدرونق ماحول میں شام گذارتی تو اس کے ذہن میں سوالات اٹھتے۔ دوسرے دن لڑکیاں اسے بتاتیں کہ انہوں نے کتنی پرکیف شام گذاری اور وہ کتنے پرلطف لمحوں سے محروم رہی تو اسکا دل اداس ہو جاتا۔ وہ سوچتی کہ اس تمام ماحول سے علیحدہ رہ کر وہ کیسے زندگی گذار سکتی ہے۔ اگرچہ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا قومی پس منظر، اس کا مذہب اور اسکی سماجی قدریں ان سے مختلف ہیں مگر وہ عمر کے اس دور میں تھی جب اس کے لئے یہ تمام کچھ بہت پرکشش تھا۔ اس کا دل للچاتا کہ اسے بھی یہ سب کرنے کی اجازت ہو۔ اسکا معصوم ذہن الجھ جاتا۔ یہ اسکا فیصلہ نہ تھا کہ اس کے ماں باپ نے ارادی طور پر اس معاشرے اور اس ملک کو اختیار کیا تھا۔ وہ اسی سرزمین پر پیدا ہوئی تھی وہ بھی ایسی ہی امریکن تھی جیسے دوسرے۔ اسے خیال آتا کہ یہ تو اس کے ماں باپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ وہ اپنے مادی فائدے کے لئے ایک ایسے ملک کی شہریت اختیار کر رہے ہیں جو ان کے ماحول و مذہب سے مختلف ہے۔ اس میں اس کا اپنا تو کوئی قصور نہیں۔ وہ ایک نفسیاتی ٹکراؤ کا شکار تھی۔ وہ بڑی حد تک ایک دہری شخصیت کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

وقت کے ساتھ یہ نفسیاتی ٹکراؤ بڑھتا گیا۔ اسکی سوچ اور اس کے طرز زندگی میں جو خلیج تھی وہ وسیع ہوتی گئی۔ اس میں بغاوت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ اپنے گھرانے اور کمیونٹی کے دباؤ کی وجہ سے جس قسم کی زندگی گذار رہی تھی وہ ایسی زندگی گذارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان بندھنوں سے آزاد ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کی زندگی میں ایسا ہی ایک فیصلہ کن لمحہ اس وقت آیا جب ہائی سکول کے گریجویشن سے پہلے اس کے اسکول میں ''سینئر پروم'' کی تقریب تھی۔ امریکی روایات میں طلبہ کی زندگی میں یہ نہایت اہم، خوشیوں سے بھرپور اور عزت نفس کے حوالے سے سب سے اہم تقریب ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اسکے والدین اسے ہرگز اس تقریب میں جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اسکی تمام امریکی سہیلیاں ہفتوں سے اس کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ گفتگو میں اس بات کا چرچہ ہوتا تھا کہ کون کس کا ساتھی ہوگا۔ کیا ایسی بھی کوئی بدقسمت لڑکی ہوگی جس کو کسی کا بھی ساتھ نصیب نہ ہو۔ ایسے ہی ایک کمزور لمحے میں جب ڈیوڈ ہروٹز نے اسے اپنے ساتھ چلنے پر مدعو کیا تو اس کے سارے دفاعی بند ٹوٹ گئے۔ اس نے ڈیوڈ سے اس تقریب میں جانے کی حامی بھر لی۔ ڈیوڈ ایک بہت سنجیدہ، عادات واطوار میں بے حد مہذب اور پڑھائی میں ذہین لڑکا تھا۔ وہ یہودی تھا امریکا میں یہودی کمیونٹی اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ وہ نہایت پڑھے لکھے، بلند ہمت، اور اعلیٰ اقدار کے پاس دار تھے اسی چیز نے طاہرہ کو متاثر کیا تھا حقیقت میں اس کی کچھ امریکی سہیلیاں اس پر رشک کرنے لگیں کہ ڈیوڈ نے پروم کے لئے اس کو چنا ہے۔ طاہرہ کو یقین تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو راضی کر لے گی۔ انہیں اس پر اتنا تو اعتماد ہونا ہی چاہئے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا، احمد شاہ کی غیرت بھڑک اٹھی اس نے سختی سے اس کو گھر سے نکلنے کی ممانعت کر دی۔ وہ رات اس نے اپنے بستر میں روتے گذار دی۔ اسکا دل اسکو قبول نہیں کر رہا تھا، اس کے خیال میں ایک شام اپنی سہیلیوں اور ڈیوڈ کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھا لینا اور پروم سے لطف اندوز ہو جانے میں کیا مضائقہ تھا۔ اس کی اندرونی جنگ مزید تیز ہو گئی۔ ان ہی حالات کی وجہ سے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی اپنے انداز سے جئے گی۔ وہ ڈیوڈ سے چھپ چھپ کے ملنے لگی اب وہ اس منزل پر تھی کہ اگر کبھی اسکا ضمیر اسے اس معاملے میں ملامت بھی کرتا تو وہ اسے قائل کر دیتی۔ پھر اسکی تنہائی اور اندرونی ٹکراؤ کی کیفیت نے جو اس میں ایک بے چینی کی فضا قائم کر دی تھی اس میں ڈیوڈ اس کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ ڈیوڈ اور اسکے خیالات ملتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے بولنے سے پہلے ڈیوڈ اسکی بات سمجھ لیتا ہے۔ اسے لگتا کہ انسانوں کے وسیع ہجوم میں جیسے قدرت نے ڈیوڈ کو اسی کے لئے بنایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ زندگی کے خواب بننے لگی تھی۔

ایک دن جب احمد شاہ تھکا ہوا گھر پہنچا تھا، اس کے دروازے کی گھنٹی بجی۔اس نے دروازہ کھولا۔جھبڑی داڑھی، منڈی مونچھوں اور سرمے سے سجی آنکھوں والا ایک نوجوان کھڑا تھا۔اس کے پیروں میں چمڑے کے چپل تھے اور اسکی شرعی شلوار کے کڑک پائینچے اس کے ٹخنوں سے اونچے تھے۔اس نے کہا میں اسی کالج میں ہوں جس میں تمہاری بیٹی پڑھ رہی ہے۔پھر احمد شاہ سے کہا تمہیں معلوم ہے تمہاری بیٹی کیا کر رہی ہے۔وہ ایک یہودی لڑکے کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔اس کے بتانے پر احمد شاہ کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے بھرے بازار میں برہنہ کر دیا ہو۔اس رات طاہرہ کی واپسی پر اس نے طاہرہ سے پوچھا تو طاہرہ نے اسے بتا دیا کہ وہ سمجھتی ہے کہ زندگی کے اس طویل سفر میں اسے دیوڈ سے بہتر کوئی ساتھی نہیں مل سکتا۔اس کے بعد احمد شاہ اور طاہرہ کے درمیان دوری بڑھتی گئی، گھر کا ماحول تلخ ہوگیا ہر روز ان کے درمیان ٹکراؤ ہوتا تھا۔امریکی قانون کے تحت وہ بالغ تھی اور اس کے خیال میں وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر رہی تھی جو باعث شرم ہو سوائے اس کے کہ وہ اپنا ساتھی خود چننا چاہتی ہے۔اس لئے اس نے گھر سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ادھر طلبہ کا ایک چھوٹا سا گروہ جنہوں نے اپنے طور پر یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی کہ امت کی عزت و ناموس کی حفاظت ان کا فرض ہے وہ مستقل احمد شاہ کو طعنے دے کر بھڑکایا کرتے تھے۔ایک دن انہوں نے عشا کے بعد آکر احمد شاہ سے کہا کہ نئی خبر یہ ہے کہ وہ کل اس یہودی سے کورٹ میں شادی کر کے اس کے ساتھ رہنے جا رہی ہے۔''اوئے احمد شاہ کچھ شرم کرو۔۔یہ شادی نہیں زنا ہے۔مسلمان لڑکی کا کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں ہو سکتا۔تو کیسا مرد ہے ایک لڑکی پر قابو نہیں پا سکتا۔کیا تجھے خبر نہیں کہ اولاد کی بے راہ روی کے لئے ماں باپ کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے تو اللہ رب العزت کو کیا جواب دیگا'' وہ رات احمد شاہ پر بہت بھاری تھی۔وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔اسے اپنے باپ کا اونچا طرہ نظر آرہا تھا جو کبھی جھکا نہیں تھا۔اسے اپنی ماں بہنوں کی پاکیزگی کا خیال آتا تھا جنہوں نے چادر اور چار دیواری کا احترام کیا تھا۔اسے تصور میں اپنے بچپن کے مولوی صاحب کا چہرہ دکھائی دیا جو کہہ رہے تھے'' زنا کی سزا پتھراؤ ہے۔۔اور اس میں ہرگز رحم نہ کیا جائے کہ یہی حکم الٰہی ہے''۔اس کے سلگتے ہوئے ذہن نے کہا''پھر طاہرہ تو میری اپنی تخلیق ۔ میں ہی اسے اس دنیا میں لایا تھا مجھے اسے مٹانے پورا پورا اختیار ہے۔جب ایک مصور کی تصویر بگڑ جاتی ہے تو وہ بھی تو اسے مٹا دیتا ہے''۔صبح تک اس کا خون غیرت اور غصے سے ابلنے لگا تھا۔وہ مزید سو نہ سکا اور ایک ایسے جوش کے تحت جب اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے عین اس وقت طاہرہ کے اپارٹمنٹ پہنچا جب وہ کالج کے لئے نکلتی تھی۔وہ جیسے ہی نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھی احمد شاہ نے اپنی پستول کی ساری گولیاں اس پر خالی کردیں۔وہ گری، اسکے سینے سے خون ابل رہا تھا اس نے گردن موڑ کر عجیب نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا، ایسی نظروں سے جو پوچھ رہی تھیں''ابو۔۔میں نے کیا کیا تھا، صرف یہی نا کہ میں اپنی مرضی سے اس دنیا میں جینا چاہتی تھی اور اپنا جیون ساتھی خود چننا چاہتی تھی۔۔''

احمد شاہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ کہنے لگا مولوی صاحب میں وہ آنکھیں نہیں بھول سکتا اور اسکا یہ سوال میرے ذہن میں اب بھی چکر لگا تا رہتا ہے مگر میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔۔کیا آپ کے پاس اسکا جواب ہے؟؟

سردار عابد علی خاں/ اٹک

یہ جو مجھ میں تیرا جمال ہے یہ کمال ہے،
مرے سر میں جو تری تال ہے یہ کمال ہے
تو یہیں کہیں مرے پاس ہے کہیں جا کے بھی
ترے ہجر میں جو وصال ہے یہ کمال ہے
جہاں بولنے پہ ہیں قدغنیں اُسی شہر میں
کسی لب پہ پھر بھی سوال ہے یہ کمال ہے
وہاں زندگی کی نمود اپنے عروج پر
یہاں سانس لینا محال ہے یہ کمال ہے
وہ جو اپنی ذات میں قید ہے وہ تو صید ہے
جسے ہر کسی کا خیال ہے یہ کمال ہے
جو ولید ہے کئی معرکوں کی کلید ہے
جو اذانِ مردِ بلالؓ ہے یہ کمال ہے
تجھے اور کوئی بھی پیرہن نہیں آئے گا
یہ جو شاعری کی مثال ہے یہ کمال ہے

✦✦✦

حشر ایسا اُٹھا دیا جائے
قصر ہر اک گرا دیا جائے
پھر وہ طوفان تھم ہی جاتا ہے
جب اُسے راستہ دیا جائے
عدل قائم ہو اپنی دھرتی پر
ظلم جڑ سے مٹا دیا جائے
جانے کس ڈر سے توڑ دیتا ہے
س کو بھی آئنہ دیا جائے
میں ہوں سقراط عصرِ حاضر کا
زہر مجھ کو پلا دیا جائے
پاس محرومیوں کے کچھ بھی نہیں
اپنے بچوں کو کیا دیا جائے
پیشیاں بھگتیں کب تلک عابدؔ
فیصلہ اب سنا دیا جائے

عاصم بخاری کی شاعری میں مقامیت

مقبول ذکی مقبول/ بھکر

ترے اشعار میں عاصم بخاری
میانوالی کی ساری ہے روایت

عاصم بخاری کا تعلق میانوالی سے ہے۔ تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ جدید لب ولہجہ کی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ہمہ اوقات پڑھنا پڑھانا ہی ان کا مشغلہ ہے۔ کتاب وقلم دوستی ان کا تعارف ہے۔ شعر گوئی کا بھی ایک اپنا انداز ہے۔

بہ قول شاعر:

ہر مسافر کی ایک منزل ہے
راستے بے شمار ، ہوتے ہیں

مقامیت کی تعریف استقرائی واستخراجی طریق سے قاری پہ چھوڑتے ہوئے اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

عاصم بخاری کی شاعری میں محبت کا موضوع ملتا ہے مگر ان کی زیادہ تر پہچان ان کی رویوں سے متعلق شاعری سے ہے۔ عصری حسیت ان کے ہاں کچھ زیادہ پائی جاتی ہے۔ اپنے گردوپیش پر ان کی کڑی نظر ہے۔ ان کا بیدار تخیل اپنی قوتِ پرواز سے اَن دیکھی اور اَن سنی کو محسوس کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا مشاہدہ ء فطرت انہیں اپنے ماحول سے بے خبر نہیں رہنے دیتا۔

میانوالی کے باسیوں کی حیاداری شرافت ور عورت کے لحاظ واحترام کے حوالے سے ان کا ایک شعر دیکھیں۔

یہاں عورت سے "موٹروے" سا برتاؤ نہیں ہوتا
میانوالی کی مٹی میں ، وفا بھی ہے حیا بھی ہے

میانوالی کی ثقافت اور روایت میں لوگوں کے اندر منافقت نہیں بلکہ دوبدو دوستی ہوگی تو دوستی اگر دشمنی ہوگی تو دشمی، کھرے پن اور میانوالی کی جذباتیت کی عکاسی کچھ ایسے کرتے ہیں۔ سہل ممتنع کی مثال شعر دیکھیں

ہوا کرتی ہیں عاصم ، انتہا پر
ہماری دوستی بھی دشمنی بھی

شاعر اپنے وسیب کی ایک اور خوبی کا بیان کچھ اس انداز میں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

شعر ملاحظہ ہو:

کھل کے کرتے ہیں اظہار یہ جذبوں کا
خوبی ہے یا خامی میرے لوگوں کی

علاقائیت عاصم بخاری کی شاعری میں حب الوطنی کا روپ دھارتی دکھائی دیتی ہے۔ شاعر چوں کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے لہٰذا ایک شعر میں کچھ ایسے اظہارِ محبت کرتے ہیں

تری آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اس کا نام لینے سے
تجھے اپنے علاقے سے بڑی عاصم محبت ہے

معاشرتی اور سماجی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے جمود کو توڑتے دکھائی دیتے ہیں کہ ہمارا دہرا معیار کیوں ہے مردانہ غالب سوچ پہ غور کی دعوت یوں دیتے ہیں۔

بیٹے کو قتل کرتا نہیں کوئی کس لیے ؟
بیٹی ہی قتل ہوتی ہے غیرت کے نام پر

اِسی مزاج کا ایک اور شعر بھی سماج کی فکر کی جھیل کے جمود کو یوں توڑتا دکھائی دیتا ہے

گھر کی عزت کا بیٹی کے جیسے
بیٹے پر بھی خیال ، لازم ہے

میانوالی کے جوانوں کی خوب صورتی کا ذکر اس مصرع میں دیکھیں:

قد آور وسرخ سفید میانوالی کے گبھرو

علاقہ اور وسیب کی سادگی اور خلوص سے بھی یہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے یہ ان کے گہرے مشاہدے اور اردگرد سے باخبری کی دلیل ہے۔ شعر میں علاقائی روایات پر کاربندی اور اچھے پہلو کا اپنا انداز دیکھیں۔

ترا عاصم علاقہ یہ ابھی تک تو نہیں بدلا
وہی سادگی اس میں ، وہی اخلاص ملتا ہے

علاقائیت کی خصوصیات میں اخلاص اور مہمان نوازی کو شعر میں کس خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں۔

ابھی مہمان کی آمد پہ خوش ہوتے ہیں یہ سارے
تمہارے گاؤں میں عاصم، ابھی اخلاص باقی ہے

مقامی ماحول میں دیہاتی فضا میں پیار محبت خلوص ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی باخبری کا نقشہ چھوٹی بحر کے شعر میں یوں کھینچتے ہیں۔

ابھی لوگ مل ، بیٹھتے ہیں یہاں
ابھی تک ہیں آباد ، یاں بیٹھکیں

اپنے وسیب اور رہتل کی ترقی پر کھ ایسا اظہارِ مسرت کرتے ہیں۔

اب کہاں وہ رہی میانوالی
یہ بھی لاہور ، لاڑکانہ ہے

اِسی بات کو ایک اور خوب صورت زاویے سے دیکھئے کیا خوب انداز میں پیش کرتے ہیں

شہری چادر ہے اوڑھ لی اِس نے
گاؤں ، گاؤں نہیں ، رہا اپنا

اپنے وسیب کی روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے باسیوں کا ذکر کچھ اس ڈھنگ سے کرتے ہیں

ہے تعارف یہ میرے لوگوں کا
بات رکھتے ہیں جان دیتے ہیں

ان کی شاعری میں ان کی دھرتی کے قدرتی مناظر کو بھی شعری قالب میں خوب صورتی سے ڈھالا گیا ہے۔

یہاں دریا بھی ہے کہسار بادل بھی نظارے بھی
ہمارے واسطے عاصم ، یہی کشمیر مری ہے

علاقائی مزاج کی نباضی بھی ان کے ہاں مزاج آشنائی کے لیے سنگِ میل کا کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے۔

شعر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

محبت میں لٹا دیتے ہیں سب کچھ
روایت ہے ، یہی عاصم ، ہماری

میانوالی کی مقامیت ثقافت اور روایت کا احاطہ کرتے بیسیوں ، اچھوتے اور نادر خالات کے حامل اشعار پروفیسر عاصم بخاری صاحب کی شاعری میں ہمیں جا بجا مل جاتے ہیں۔ ان کی شاعری سے ثقافت و روایت کی مکمل تصویر چلتی پھرتی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ کسی حد تک اسے ہم تصویر میانوالی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ مقامیت کے کئی ایک پہلوں کا احاطہ کرتی شاعری بھی موجود ہے۔ مگر طوالت کے پیش وہ پھر سہی----

آخر میں میانوالی کی مقامیت کی مناسبت سے مزید چند اشعار قارئین کی نظر کر کے اجازت:

تمہارے شہر میں ہوں کیوں زیادہ
یہ مجھ سے پوچھتی ہے قتل و غارت

ڈھلکتے آنچلوں کو جوڑتی ہیں اہتمام سے
کہ سن اذاں کو عورتیں ابھی مرے وسیب کی

کروں وار چھپ کے بھلا اس پہ کیسے
نہیں دیتی مجھ کو اجازت ، روایت

کسی کی موت پر عاصم، مرے گاؤں کے ہر اک کو
ابھی افسوس ہوتا ہے، ابھی دکھ درد ہوتا ہے

نہیں "پینا ڈال" ان کو عاصم میسر
مرے شہر میں لوگ یوں جی رہے ہیں

مرد بھی ڈھانپتے تھے سر اپنا
تم تو عورت ی بات ،کرتے ہو

اب تو "کاں" بھی "بنیرے" پر آ کر
خبریں مہمان کی نہیں دیتا

✧✧✧

اظہر جاوید

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2022 تک

ماہنامہ ''تخلیق'' اب تک 11 ''تخلیق ایوارڈ'' دے چکا ہے

نان اظہر جاوید

جناب شفیع عقیل صاحب (کراچی) 2012، 021-34816655

محترم پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب (لاہور) 2017، 0345-4698398

جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب (لاہور) 2013، 0334-9719278

محترم سرفراز سید صاحب (لاہور) 2018، 0333-4148962

محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ (لاہور) 2014، 0333-4221870

محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ (لاہور) 2019، 0300-9438596

محترمہ نیر جہاں صاحبہ (امریکہ) 2015، 001-3109870978

محترم رشید امجد صاحب (راولپنڈی) 2020، 0334-5164855

محترمہ عذرا اصغر صاحبہ (لاہور) 2016، 0300-8839895

محترم آغا گل صاحب (کوئٹہ) 2021، 0334-5164855

محترم حنیف باوا صاحب (جھنگ) 2022، 03180493982

12واں تخلیق ایوارڈ 2023

عدیل احمد آسی / کوپن ہیگن ڈنمارک

مقدر سے بڑھ کر دعا پر یقیں ہے
مجھے تو خود اپنے خدا پر یقیں ہے
لبوں سے جو نکلے تو ہو جائے پوری
مجھے ٹوٹے دل کی صدا پر یقیں ہے
روزے، نمازیں تو ہیں اک بہانہ
مجھے آپؐ کی ہر ادا پر یقیں ہے
وہ جس حال میں بھی مجھے رکھے خوش ہوں
مجھے اپنے رب کی رضا پر یقیں ہے
مرا ہاتھ تھامیں گے وہ روزِ محشر
یقیں رحمتوں پر عطا پر یقیں ہے
بنامِ محمدؐ برستی رہے گی
مجھے نعمتوں کی گھٹا پر یقیں ہے
پریشانیاں ہیں گھڑی دو گھڑی کی
مجھے آسی حمد و ثنا پر یقیں ہے

ہے ایک بستی کہیں شہرِ خواب سے آگے
جواب کیا ہو کہ ہے لاجواب سے آگے
یہ بے سبب تو نہیں ہے مرا دوانہ پن
کچھ اور بھی ہے تمہارے شباب سے آگے
ذرا سی دیر یہاں سطحِ آب پر ہوں میں
یہ زندگی ہے مری کیا حباب سے آگے
ڈرا رہے ہیں ادھر مجھ کو روزِ محشر سے
ادھر میں سوچ رہا ہوں حساب سے آگے
اسی لیے تو وہ سربسجود رہتی ہے
کہ دیکھا کرتی ہے تتلی گلاب سے آگے
تمہارے نام سے منسوب زیست کر دی ہے
خیال آتا ہے اب انتساب سے آگے
اسے کتاب سمجھ کر میں پڑھ رہا تھا مگر
وہ شخص نکلا ہے آسی کتاب سے آگے
شیوخ رہتے ہیں گنتی میں روز و شب اُلجھے
مجھے تو جانا ہے آسی ثواب سے آگے

ہم نے یونہی ہر شب دیپ جلایا تھا
جانے والا لوٹ کے پھر کب آیا تھا
جانے کیوں ہر بار ہمیں وہ اچھا لگا
جانے اس نے کتنی بار ستایا تھا
اس کے ہجر میں بینائی بھی جاتی رہی
جب وہ آیا تو پہچان نہ پایا تھا
دھوپ میں جل کر پیڑ نے سب کو بخشی چھاؤں
ورنہ تو درکار اسے بھی سایا تھا
آندھی اب اس گھر کو توڑنا چاہتی ہے
تنکا تنکا جوڑ کے جس کو بنایا تھا
خوشیاں دینے والے بھی ہیں لوگ بہت
لیکن یاد آتا ہے جس نے رُلایا تھا
اس نے مجھ کو جھوٹے خواب دکھائے تھے
میں نے اس کو باتوں سے بہلایا تھا

مت کبھی کم ظرف پر احسان کر
ورنہ دھوکا کھائے گا، پہچان کر
پہلے وعدے کو نبھانا سیکھ تو
پھر کسی سے عہد کر پیمان کر
جھیل دکھ پہلے خسارے کا یہاں
یہ نہ ہو تو اور کا نقصان کر
سچ کی خاطر ڈر نہ ہو رُسوائی کا
اس قدر مضبوط تو ایمان کر
پہلے اس کے پلو کو آنچل بنا
پھر اسی کی زلف کو زندان کر
مت دیا کر تو مثالیں اور کی
اپنے ہی اسلاف پر تو مان کر
کام کوئی منفرد کر کے دکھا
آسی ساری دنیا کو حیران کر

عجب رنگ اپنے دکھاتا ہے عشق
اناالحق کا نعرہ لگاتا ہے عشق
کہیں گل بدلتے ہوئے راکھ میں
کہیں راکھ سے گل بناتا ہے عشق
الگ ضابطہ ہے میاں عشق کا
ہوا سے دیے کا جلاتا ہے عشق
کبھی نوکِ نیزہ پہ قرآں پڑھے
کبھی زیرِ خنجر ہنساتا ہے عشق
کہے خود خدا سے کہ جلوہ دکھا
کبھی کوہ، ریزہ بناتا ہے عشق
ڈبو دے کبھی اپنے اشکوں میں اور
کبھی پانیوں پر چلاتا ہے عشق
پرندوں سے ہوتی ہوئی گفتگو
ہواؤں میں اُڑنا سکھاتا ہے عشق
کڑے آسی ہیں امتحاں عشق کے
کہ گردن پہ آرے چلاتا ہے عشق

ادبی خبریں

وفیات

☆ شاعر صابر وسیم انتقال کر گئے ہیں۔ مرحوم عمر بھر شعر و ادب سے وابستہ رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دامانِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

☆ خوب صورت لب و لہجے کے شاعر ریاض ساغر گزشتہ دنوں مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے۔ پروردگار غریقِ رحمت کرے۔ مغفرت فرمائے آمین۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

☆ شاعر سلیم صابر گزشتہ دنوں وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

☆ واہ کے نامور ادیب، شاعر، مصنف، صحافی اور دوستوں کے دوست جناب شعیب ہمیش صاحب کا رضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

ادبی خبریں

☆ معروف شاعر نذیر قیصر کے اعزاز میں مسعود علی خان نے شاندار عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں سلمیٰ اعوان، شعیب محسن، ڈاکٹر پرنم نورین، شہزاد احمد بھٹی اور عابدہ قیصر و دیگر نے شرکت کی۔ نذیر قیصر کی فن و شخصیت کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ اُس کے بعد ڈنر کا اہتمام تھا۔

☆ دو جولائی کو امریکہ کے دارالحکومت نیویارک میں حلقہ اربابِ ذوق نیویارک کے زیر اہتمام سالانہ معاشرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت افتخار عارف نے کی۔ حلقہ ارباب ذوق کے اراکین کے علاوہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید، محبوب ظفر، قمر رضا شہزاد، مقصود وفا، عاطف توقیر، احمد سلمان، فخر عباس اور صائمہ زیدی نے شرکت کی۔

☆ تخلیق کے زیر اہتمام فالکن سوسائٹی کلب میں معروف شاعر، سفرنامہ نگار، کالم نویس اور مدیر اعلیٰ ارژنگ عامر بن علی کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ملک کے نامور شاعر خالد شریف نے کی۔ مہمانان میں پروفیسر رفیق اختر اور حسن عباسی تھے۔ تخلیق کے مدیر سونان اظہر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

☆ بارہواں عالمی مشاعرہ و محفل غزل 23 جون کو بریڈفورڈ برطانیہ میں منعقد ہوئی۔ مشاعرے کی صدارت پاکستان سے ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کی۔ مہمانان میں پاکستان سے ڈاکٹر فاطمہ حسن اور عرفان صدیقی تھے۔ دیگر شعراء میں عنبرین، حسیب عنبر اور انعام ندیم نمایاں ہیں۔ مشاعرہ میں برطانیہ کے شعراء و کمیونٹی کے افراد نے بھرپور شرکت کی۔

☆ انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام وحید مرزا، فراست بخاری، تاثیر نقوی اور روبینہ راجپوت کی سالگرہ ایک ساتھ منائی گئی۔ نیز ماہ جون میں پیدا ہونے والی مرحوم شخصیات کی یاد میں تقریب کا انعقاد بھی کیا گیا۔ منور ظریف، مسعود رانا اور قائم نقوی مرحوم کے حوالے سے گفتگو ڈاکٹر ابرار احمد نے کی۔

☆ پشتو زبان کے عظیم شاعر رحمان بابا کے نام سے منسوب ایوارڈ مورخہ 24 جون 2023 کو پاکستان کے شہر ژوب میں تعلیم فاؤنڈیشن کی جانب سے محسن شکیل کو عطا کیا گیا۔

☆ اکادمی ادبیات ملتان کے زیر اہتمام اظہر سلیم مجوکہ نے اسلام آباد میں مقیم مزاحیہ شاعر فیصل عزیز کے شعری مجموعے ''غلط پارکنگ'' کی تقریب پذیرائی منعقد کی۔ جس میں ملتان کے اہل قلم نے بھرپور شرکت کی۔ تقریب میں فیصل عزیز نے اپنی مزاحیہ شاعری سنا کر محفل کو کشتِ زعفران بنا دیا۔

☆ شیخوپورہ کی ادبی تنظیم دریچہ کے زیر اہتمام نامور شاعر اور سابق ADCG شیخوپورہ شبیر حسین بٹ کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر جواز جعفری نے کی۔ مہمانانِ خصوصی عرفان صادق اور علی صدف تھے۔

☆ ہزارہ کے ہندکو ادب میں پہلے نعتیہ مجموعے ''صفتاں سرکاردیاں'' کی تقریب رونمائی۔

بزم علم و فن پاکستان (ہزارہ) کے زیر اہتمام ہزارہ کے ہندکو ادب میں نعت کی پہلی کتاب ''صفتاں سرکاردیاں'' کی تقریب رونمائی ماڈرن ایج پبلک سکول و کالج ایبٹ آباد میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت معروف علمی ادبی اور سماجی شخصیت صاحبزادہ جواد الفیضی نے کی۔ معروف شاعرہ، ادیبہ اور نعت کی چھ کتابوں کی مصنفہ، پرائیڈ آف پرفارمنس مادام بشریٰ فرخ مہمان خصوصی، بزم اہل سخن کے صدر اور معروف شاعر قاضی ناصر بخت یار اور کراچی سے تشریف لانے والے معروف شاعر جناب فہیم شناس مہمانانِ اعزاز کے طور پر شریک محفل تھے۔ تقریب کی نظامت معروف سکالر ڈاکٹر عامر سہیل نے کی۔

ڈاکٹر کاشف ضیاء خان، سہیل صمیم اور سید ازہر بخاری نے کتاب پر نہایت پرمغز مقالے پیش کیے۔ جناب احمد حسین مجاہد اور ڈاکٹر عادل سعید قریشی جیسے اہل علم نے کتاب اور مصنف کے حوالے سے بہت خوبصورت گفتگو کی۔

نعت کی روایت کے ایک درخشاں باب، جناب حافظ جنید مصطفیٰ اور معروف نعت خواں منزہ وحید کی خصوصی شرکت اور خوش الحانی نے محفل کو روح پرور فضا فراہم کی۔

نامہ ہائے احباب

ارژنگ رقم مدھ بھرے حسن عباسی صاحب!

خدا آپ کو سلامت با ارادت رکھے۔ نقش بہاراں، حشر ساماں ارژنگ خوش قدم بڑے جلوے کے ساتھ وارد ہوا۔ آپ نے میری غزل شائع کی۔ آپ نے حسن ظن سے اس غزل کو دیکھا مہربانی آپ کی۔ امجد اسلام امجد کے سے عظیم ادیب شاعر ڈراما گر اور زبان و بیان کے چہیتے سے متعلق محترم انور مسعود کا مضمون دل کو لگا۔ انور مسعود جس جذبات کی شدت سے قطعہ کہتے ہیں اسی پیرائے میں یہ مضمون لکھا ہے۔ انور مسعود بالکل امجد اسلام امجد کی طرح مجھ سے سلوک رکھتے۔ ایک تو گیا دوسرے کو جناب سلامت رکھے۔ ولی عالم شاہین کی ''شب نشین'' کو عبدالوحید بسمل صاحب نے بڑی محبت سے دیکھا اور پڑھا ہے۔ مضمون کے الفاظ میں بسمل نے اخلاص مندی کے قرینے من جملہ حاضر کر دیے ہیں۔ بسمل صاحب اُردو اور ہندکو ادب میں مقبول ہوئے جاتے ہیں۔ نصیر احمد ناصر صاحب سے مکالمہ خوب رہا۔ ان کی نظم نگاری نے اچھے بھلے پر پرزے نکالے ہیں۔ ان کی سائنٹفک نظمیں ''سلیقہ غور'' کی داعی ہوا کرتی ہیں۔ میں ان کے رسالے ''تسطیر'' میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اب مدت سے غیر حاضر ہوں۔ وہ دقت نظر کے ادارتی اسباب جمع رکھتے ہیں۔

یہ اُن سے بعید نہیں کہ 'تسطیر'' جاری ہے۔ میر پور میں اس عظیم نظم نگار سے ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات میں گوشہ چشمے اور گوشۂ دل کی تاثیریں تھیں جو بھولی نہیں جاتیں۔ 'نور بنایا رستہ' کی بابت شاعر علی شاعر صاحب کے احساسات بہت متاثر کرتے ہیں۔ فی الواقع جلیل عالی صاحب بڑے شاعر ہیں۔ نعت میں ان کی جذباتی قدریں نمایاں ہیں۔ جلیل عالی صاحب کی شاعری پر میں نے بھی مضمون لکھا تھا جو ''سیارہ'' میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا مضمون نقد و نظر کا بہترین آئینہ ہے۔ ناصر عباس نیر کی تنقید معتبر ہے۔ ان سے اکادمی ادبیات اسلام آباد کی ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔

آصف ثاقب

بوئی ہزارہ

محترم و مکرم جناب عباسی صاحب!

سلام مسنون! ارژنگ کے لیے اپنی تازہ غزل ارسالِ خدمت ہے۔ آپ کی محبتوں کا ہمیشہ مقروض رہتا ہوں۔ اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔

بارش کی طرح آپ کی ہیں ہم پہ عنایات
واللہ بہت آپ کے ممنون ہیں ہم لوگ

''ارژنگ'' کا حسن روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ یہ عامر بن علی آپ اور آپ کے ادبی ٹیم کا کمال ہے۔ دعا گو ہوں۔

ع اللہ کرے زورِ جنوں اور زیادہ

آخر میں میرا اور مسعود احمد کا پرخلوص سلام۔

احمد جلیل

اوکاڑا

محترم حسن عباسی صاحب!

آداب! اُمید ہے بخیر ہوں گے۔ آپ کی توجہ اور عنایت کا شکریہ (ارژنگ) موصول ہوتا ہے اور آپ کی محنتوں کا ثبوت ہے۔ شاندار تحریروں سے لبریز ماشاءاللہ!

نثر، نظم، شاعری، وہ گوشے جہاں ایک شاعر کی پذیرائی ہوتی ہے۔ انٹرویوز، افسانے، سب کچھ بہت اعلیٰ ماشاءاللہ!!

وقت کی قلت ایسی آتی ہے کہ کچھ لکھنا پڑھنا بھول جاتا ہے۔ کار زمانہ میں مصروف ہم لوگ..... خیر یہ تو چلتا رہتا ہے مگر آپ جس طرح سے اسے سنبھالے ہوئے اور اس کی روایت کو برقرار رکھے ہیں آپ کو بہت مبارک باد۔ عامر بن علی صاحب ماشاء اللہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بہت ترقی کر رہے ہیں۔ انہیں میرا اسلام عرض کیجیے۔

لبنیٰ صفدر صاحبہ بھی اس میں اپنا بھرپور حصہ ڈال رہی ہیں۔ ماشاءاللہ

آسناتھ کنول

لاہور

محترم عامر بن علی! مدیر اعلیٰ ارژنگ

تسلیمات۔ شکر گزار ہوں کہ آپ کا پرچہ مجھے باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے۔ کراچی کی مصروف ادبی زندگی میں لاہور سے آنے والا یہ تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوتا ہے۔ کاغذ اور اس کی تحریر سے جو رشتہ مادی زندگی نے منقطع کر دیا ہے ''ارژنگ'' اس کو جوڑنے کا خوبصورت وسیلہ ہے۔ آپ کو اور ''ارژنگ'' کی پوری ٹیم کو اس محنت پر اور ادبی خدمت پر ڈھیروں داد۔

آغا تنویر کراچی

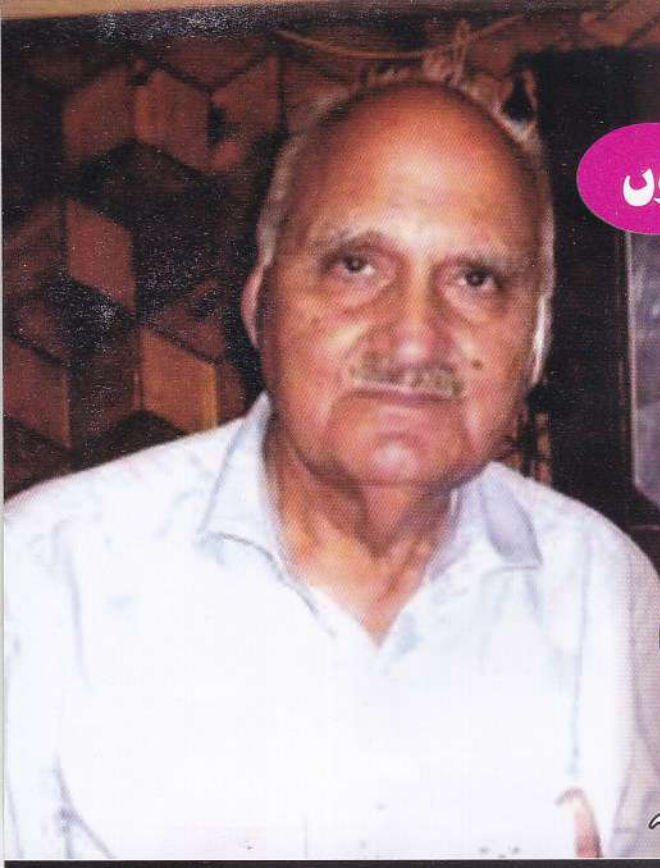

میں غالب کو بھی لاہوری سمجھتا ہوں

شعر کا فن تخلیق حسن کا فن ہے

نامور ادیب

جمیل یوسف

سے مدیرہ ارژنگ **لبنیٰ صفدر** کا مکالمہ

اہل پنجاب کے لیے اردو کوئی دوسری یا اجنبی زبان نہیں بلکہ پنجابی کی ہی علمی و ادبی شکل ہے

س: آپ نے شاعری کس عمر میں شروع کی۔ کچھ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

ج: شاعری کا شوق مجھے دس گیارہ سال کی عمر میں لگ گیا تھا۔ جب میری پہلی غزل چھپی تو میں اسلامیہ ہائی سکول چکوال میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس سے قبل بچوں کے رسالوں میں میری نظمیں چھپ رہی تھیں۔

سکول کے زمانے میں ہی مجھے غالب کا اکثر کلام فیض کی نقش فریادی اور دست صبا حفظ ہو گئے تھے۔ حفیظ کا مجموعہ نغمہ زار اور شاہ نامہ اسلام کے اکثر حصے مجھے ازبر ہو گئے۔ غالب اور میر کے مطالعے سے میرے ذہن میں شعر کا جو ایک معیار قائم ہو گیا بس میں اس کو سامنے رکھ کر مشق سخن کرتا رہا۔

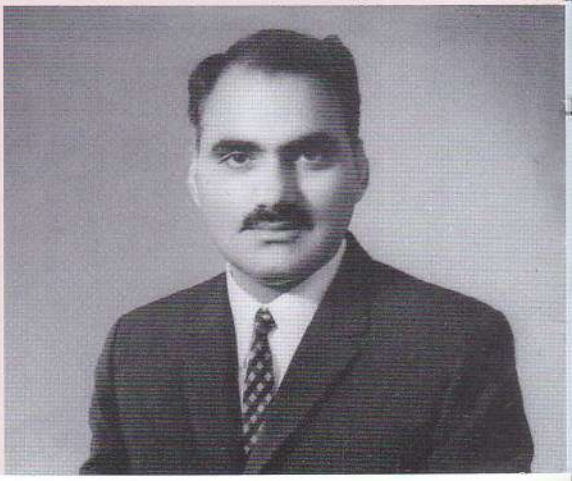

س: ان شعراء کے علاوہ دوسرے شعراء بھی آپ کے زیر مطالعہ رہے؟ باقی شعراء کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ج: کالج میں ایک وقت تھا کہ سیف الدین کی خم کاکل نے مجھے بڑا مسحور کیا۔ پھر اقبال کا مطالعہ کیا۔ اقبال ایسا عظیم شاعر ہے جس سے متاثر تو سب ہو سکتے ہیں مگر اس کے رنگ میں شعر لکھنا اور اس کی تقلید کرنا اور جو روایت اس نے قائم کی اس پر چلنا ممکن نہیں۔ فیض نے ایک مرتبہ اقبال کے بارے میں کہا تھا کہ اقبال ایک پہاڑ کی مانند ہے اور ہم اس پہاڑ کے قدموں میں بچوں کی طرح کھیل رہے ہیں۔ ان ہی دنوں میں یوسف ظفر، مجید امجد، ن۔م راشد، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، باقی صدیقی سے متعارف ہوا۔ وزیر آغا ان دنوں ادبی دنیا میں جدید شعراء پر اپنے مضامین لکھ رہے تھے جو بعد میں نظم جدید کی کروٹیں کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے میرے اندر جدید اردو نظم کی تفہیم پیدا ہوئی۔

س: یہ جو حفیظ نے کہا ہے:

حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

تو آپ کے خیال میں یہ اہل زبان کا مسئلہ کیا ہے، کیا پنجاب کے رہنے والے اہل زبان نہیں ہیں؟

ج: میں اس سلسلے میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ جب میں 1968ء میں چٹاگانگ گیا اور وہاں کے ایک مشاعرے میں اپنی غزل بنائی وہاں کے اہل زبان شاعروں سے متعارف ہوا اور ان سے بے تکلفی کے ماحول میں گپ شپ کا سلسلہ چلا تو ایک بزرگ شاعر مجھے کہنے لگے جمیل صاحب آپ تو شاعری کو سمجھتے ہیں۔ سچ سچ بتائیں کیا واقعی اقبال کو شاعر سمجھتے ہیں؟ میں نے بے ساختہ جواب دیا ''جی نہیں ہم اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے۔ ہم تو اقبال کو ''ولی'' سمجھتے ہیں۔ شاعر تو مجھ جیسے اور آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اتنی بڑی شخصیت تھی کہ اس نے بڑے بڑوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ جوش تو رہے ایک طرف علامہ مشرقی جیسی نابغہ روزگار شخصیت کو بھی اقبال نے متزلزل کر کے رکھ دیا اور وہ اپنا خاص میدان چھوڑ کر اقبال کے تتبع میں شائع کرنے لگے اور بانگ درا اور ضرب کلیم اور بال جبریل کی تقلید میں شعری مجموعے لکھ کر چھپوا ڈالے۔ یہ ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ علامہ مشرقی نے ضرب کلیم کے تتبع میں اپنا جو مجموعہ ''حرف کلیم'' کے نام سے چھپوایا۔۔۔۔۔۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

پبلک آرٹ اینڈ لٹریری سوسائٹی لاہور کے زیر اہتمام

کاسموپولیٹن کلب، باغ جناح میں عامر بن علی کے اعزاز میں محفل مشاعرہ

صدارت: خالد شریف مہمان اعزاز: ناصر بشیر، راحیلہ اشرف میزبان: مقبول احمد چوہان

خالد شریف، عامر بن علی، ناصر بشیر، راحیلہ اشرف، خالد شانی، معروف اداکار حسیب پاشا، ممتاز راشد لاہوری، توقیر شریفی، تاثیر نقوی، رقیہ غزل، افضل پارس، راشد پیرزادہ، سلیم اختر ملک، راشد الطاف، آئینہ مثال، سید فراست بخاری اور فرزانہ پیرزادہ کے علاوہ پاکستان کے اہم شعراء نے شرکت کی اور اپنا کلام سنایا۔

محفل مشاعرہ کا ایک منظر

کاسموپولیٹن کلب کے صدر اور میزبان عامر بن علی کو شیلڈ پیش کر رہے ہیں

حاضرینِ محفل